دستاویز کی ہو گئی ہے، اس سے جشن کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور جو لوگ اجلاس میں شریک تھے، اور جو نہیں شریک تھے، دونوں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں،

"ض"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس، اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :- دار المصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت — ماہانہ

نام پرنٹر — سید اقبال احمد

قومیت — ہندوستانی

پتہ — دار المصنفین اعظم گڈھ

نام پبلشر — " " "

قومیت — ہندوستانی

پتہ — دار المصنفین اعظم گڈھ

اڈیٹر — صباح الدین عبدالرحمن، عبدالسلام قدوائی ندوی

قومیت — ہندوستانی

پتہ — دار المصنفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

سید اقبال احمد

جلد ۱۲۰ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۷ء عدد ۴

مضامین

شذرات

اس وقت ملک میں ایک اہم سیاسی تبدیلی آگئی ہے، مرکزی حکومت پر نیشنل کانگریس پارٹی کا اقتدار تیس سال تک رہا، لیکن گذشتہ مہینہ کے عام انتخاب میں اس کو ایسی بری طرح شکست ہوئی کہ بڑے سے بڑے سیاسی پنڈت کو بھی اس کی توقع نہ تھی ؎

جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبطِ عشق کی سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا

گیارہ سال کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں مسز اندرا گاندھی کی فہم، ادراک، قوت فیصلہ، پارلیمانی خطابت، پاکستان سے محاذ آرائی، بین الاقوامی حکمت عملی، عوام سے رابطہ رکھنے میں طوفانی دورہ، مرکز سے گریز پا تحریکوں کے خلاف جرأت مندانہ اقدام، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت، [illegible] کے فروغ، جنگی اسلحہ کی غیر معمولی پیداوار اور ایٹم برائے امن کے دھماکے کا میاب تجربہ وغیرہ کی دھوم رہی اور شہرت ہوئی کہ وہ اپنے نامور باپ سے بھی آگے بڑھ گئیں، اقبال انکے گھر کے دروازہ پر دستک دیتا رہا، کامرانی انکے قدموں کو چومتی رہی، بڑے بڑے صاحب ادعا رہنما انکے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے، اپنے زریں کارناموں کی وجہ سے چاندی میں تولی گئیں اور درگا دیوی کہلائیں۔

مگر اچانک الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک جج کا فیصلہ انکے خلاف ہوا تو انھوں نے ملک میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا، اسکے نفاذ میں انکو بعض ایسے اقدام کرنے پڑے جس سے انکی ہر دلعزیزی خوف میں تبدیل ہو گئی، پھر بھی اقبال انکا ہمرکاب رہا، ضروری اشیا کی بڑھتی ہوئی قیمتیں قابو میں آگئیں، فرقہ وارانہ فسادات رک گئے، اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم بہتر سے بہتر ہونے لگی، سرکاری دفتروں کی کارکردگی بڑھ گئی، کارخانوں میں ہڑتال بند ہو گئی، پیداوار بڑھنے لگی، غلہ میں ملک خود کفیل بھی ہو گیا، انیس مہینے میں چند ہنگاموں کے علاوہ امن رہا۔

جب انھوں نے یکایک لوک سبھا کے انتخاب کا اعلان کیا تو انکے آفتاب اقبال میں گہن لگ گیا، ہر طرف شور بلند ہوا کہ انکی حکومت آمرانہ ہے، انھوں نے جابرانہ انداز میں ایمرجنسی کا نفاذ کر دیا، ظالمانہ طور سے ہزاروں لیڈروں کو جیل بھجوا دیا، قاہرانہ طور پر عدلیہ اور اخباروں کی آزادی پر پابندی لگا دی، اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی خاطر دستور میں ترمیم کرائی، خاندانی منصوبہ بندی کی غیر انسانی مہم چلا کر گھر یلو مسرت

کو برباد کیا، اپنے لڑکے کو سیاست میں لاکر حکومت کو موروثی بنانا چاہا، مسلم یونیورسٹی کو اسکے اقلیتی کردار سے محروم کر کے مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کی کوشش کی، وغیرہ وغیرہ۔ انکے خلاف سڑکوں اور گلیوں میں ایسے نعرے بلند ہونے لگے کہ انکو سنکر حیا کی گردنیں اور شرم کی آنکھیں جھکنے لگیں، انھوں نے اپنی مدافعت میں ملک کا طوفانی دورہ کیا، مگر لوگوں کا غیظ و غضب کم ہونے کے بجائے اتنا بڑھا کہ دس سال کی ڈرامائی سیاست کی ہیروئن اور لوگوں کے تخیل کی درگا دیوی کا اقبال انکی کانگریس پارٹی کے ساتھ بیاس، راوی، جمنا، گنگا اور خلیج بنگال میں غرق آب ہو گیا،

عوام کے اس فیصلے سے ملک کی اکثریت خوش نظر آتی ہے، مگر مورخ کے لیے ایک اہم موضوع رہیگا کہ شیرنی کا کلیجہ رکھنے والی، شاہین کی طرح جھپٹنے والی اور ہرنی کی طرح چوکڑی بھرنے والی اس خاتون نے وزارت عظمیٰ کے فرائض کس طرح انجام دیے، اور وہی ناقدانہ تجزیہ کر سکیں گے کہ انکی کارگذاریاں انکی کوتاہیوں کے نیچے دب کر رہ جائیں گی، یا ان کی کوتاہیاں ان کی کارگذاریوں کے مقابلہ میں نظر انداز ہو جائیں گی،

تاریخی شخصیتوں کے لیے ناکامیوں کے المناک حوادث کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہوتے، لوئی شانزدہم، نپولین اعظم، بسمارک، لائڈ جارج اور ونسٹن چرچل کی سیاسی زندگی میں بہت سی محرومیاں رہیں مگر تاریخ انکے کارناموں سے بھری ہوئی ہے، مولانا محمد علی کو زندگی بھر ناکامیوں سے سابقہ رہا، مگر انکا نپولین کا ایسا دل، برک کی ایسی زبان اور میکاولے کا ایسا قلم برابر یاد کیا جاتا رہیگا، گاندھی جی جب ہندوستان کے باپو قرار دیے گئے تو انکو گولی کا نشانہ بنایا گیا، ہمالیہ اور تاج محل کے ساتھ پنڈت جواہر لال بھی دنیا کے عجائب روزگار میں شمار کیے جاتے تھے، چین کی لڑائی میں شکست کھا گئے، مگر تاریخ میں انکی عظمت برقرار رہیگی، اسی طرح اندرا گاندھی اپنی کامیاب اور کامران زندگی کے بعد موجودہ انتخاب میں شکست کھا گئیں، انکے ساتھ کانگریس پارٹی کو بھی ہزیمت ہوئی، اسکے پیچھے ۹۰ سال کی جو تابناک تاریخ ہے وہ ہمیشہ زریں حروف سے لکھی جائیگی، مگر دونوں کی پسپائی میں ہندوستان کیلیے یہ سیاسی پیام ہے کہ مفاد پرست اور ناعاقبت اندیش مشیروں کی رائے سے غیر محتاطہ غیر مآل اندیشانہ، عاجلانہ اور جابرانہ اقدام کرنے سے سیاست اور تاریخ کا رخ بدل جاتا ہے۔

جے پرکاش نرائن موجودہ سیاسی تبدیلی کے ہیرو ہیں، وہ شروع سے ہندوستان کیلیے برطانوی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کو ناپسند کرتے رہے ہیں، مگر اسکا نعم البدل تجویز نہ کر سکے، کبھی دو پارٹیوں اور کبھی پارٹیوں کے بغیر والی جمہوریت کو اچھا کہتے، موجودہ سیاسی رجحان دو پارٹیوں کی جمہوریت کا ہے، جو خدا کرے ملک کے لیے مبارک شگون ہو، مگر کانگریس اور جنتا پارٹی میں فرق یہ ہے کہ کانگریس کی آئیڈیالوجی برسوں کے سیاسی تجربے

بعد مرتب ہوئی تھی، جنتا پارٹی مختلف جماعتوں سے مل کر بنی ہے جن کی وجہ اشتراک اندرا گاندھی اور کانگریس سے بیزاری ہے،
نفرت اور دشمنی کی بنیاد پر بننے والی جماعتوں کا مستقبل بہت یقینی نہیں ہوتا، بنگلہ دیش اور پاکستان میں اس کی مثالیں موجود ہیں

جب سے جمہوریت کا تخیل پیدا ہوا ہے اس وقت سے اب تک جمہوری حکومتوں کی کامیابی غیر یقینی سمجھی جاتی ہے، لارڈ
اٹیلی نے دہلی میں آزاد میموریل لکچر میں کہا تھا کہ سنہ ۱۹۱۱ء تک برطانیہ کی پارلیمانی جمہوریت کا کامیاب ہونا یقینی نہیں
سمجھا جاتا تھا، ارسطو کا خیال ہے کہ جمہوریت معاشی حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، وہ عوام کی جمہوریت کو اکسٹریم
ڈیموکریسی کہتا ہے، اس کی رائے کے مطابق اس میں ڈیماگوگس (شورش پسند خطیب) زیادہ پیدا ہوتے ہیں جن کو اپنے عوام
کی مرضی کا خیال زیادہ رکھنا پڑتا ہے، اس کے بعد نظم و نسق کا اچھا ہونا، اور قانون کے احترام کا باقی رہنا ضروری نہیں،
نفسیاتی طور پر عوام کے نزدیک جہل سے مہمل اعتراضات اور ان کے مہمل ترین جوابات بھی قابل قبول ہوتے ہیں، عوامی
لہریں اعلیٰ دماغ افراد کے بھی قوائے عقلی ماند کر جاتی ہیں، ایک فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے کہ ارسطو اسی وقت تک ارسطو ہے
جب تک ایک مصنف کی حیثیت سے حجرہ نشین ہے، جب وہ کسی جماعت کا رکن بن جاتا ہے تو منجملہ دیگر احمقوں کے ایک احمق
وہ بھی ہے، عوام میں سیاسی شعور کی پختگی نہ ہونے کی وجہ سے ہیجان پسندی، اشتعال پذیری اور تلون مزاجی ہوتی ہے، اسلئے
عوامی جمہوریت میں ارسطو کے خیال کے مطابق یہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ احمق عاقل اور عاقل احمق بن جائیں،
اچھی جمہوریت یہ ہے کہ موثر قیادت عوامی جذبات کا صحیح امالہ کرتی رہے،

ہندوستان میں یہ اپنی خامیوں اور مشکلوں کے باوجود اس لئے چلتی رہی کہ کانگریس کی حکومتیں
اس کی شاندار روایت اور طاقتور تنظیم کی بدولت مرکز اور ریاستوں میں قائم ہوتی رہیں، ان میں بڑی ہم آہنگی
رہی، ملک کی جمہوریت کا وہ دور بہت ہی تشویشناک ہوگا جب مرکز اور ریاستوں میں مختلف نصب العین کی
پارٹیوں کی حکومتیں ہوں گی، عوام نے ریاستوں میں کانگریسی حکومتوں کے مقابلہ میں مرکز میں جنتا پارٹی کو
برسر اقتدار لاکر ایک نیا سیاسی تجربہ کیا ہے، دعا ہے کہ یہ کامیاب ہو، مسلمانوں کی اکثریت نے جس جوش و خروش
کے ساتھ جنتا پارٹی کو کامیاب بنایا ہے، اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار
بحال ہو، مسلمانوں کے پرسنل لا میں حکومت کی مداخلت نہ ہو، ان کی آبادی کے لحاظ سے ان کو ملازمتیں ملیں،
اردو کو جائز مقام حاصل ہو، امید کہ جنتا پارٹی ان کو مایوس نہ کرے گی،

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

اشاعت اسلام[1] اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو کارل مارکس
اور لینن نے کمیونزم کی تبلیغ میں اختیار کیا، اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت تھی کہ دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے،
جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے کفر اختیار کرے، اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ آپ کا کام صرف
خدا کا پیام پہنچا دینا تھا، اگر لوگ اس سے روگردانی کریں تو اس کی ذمہ داری ان پر ہی، آپ پر
نہیں، لیکن آپ کو یہ بھی ہدایت دی گئی تھی کہ غافلوں کو ہشیار کریں، تمام انسانوں کو رب العٰلمین کی
خوشخبری سنائیں، اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں، مگر اس کے لیے دانشمندانہ

---

[1] اس مقالہ کی پہلی اشاعت میں ذکر کیا گیا تھا کہ یہ پاکستان کی بین الاقوامی سیرت کانگریس میں پیش ہوا تھا جو محدود
وقت کے لحاظ سے مختصر طریقہ پر لکھا گیا تھا، اس کی پہلی اور دوسری قسطیں پڑھ کر معارف کے بعض ناظرین کا
تقاضا ہوا کہ یہ سلسلہ جاری رکھا جائے، اسلئے مذکورۂ بالا کانگریس کے مقالہ میں جو باتیں اجمالی طور پر لکھی گئی
تھیں، اب تفصیل کے ساتھ بیان کی جا رہی ہیں، اگر معارف کے ناظرین کو یہ سلسلہ پسند آیا تو آئندہ بھی جاری رکھا جائیگا،

اور پسندیدہ طریقہ اپنائیں، اسی ہدایت کے مطابق آپ نے ربانی پیامات کی خوشخبری سنانے اور غافلوں کو ہشیار کرنے کیلئے مختلف جگہوں پر تبلیغی مشن بھیجے، مثلاً حضرت مالکؓ بن مرارہ الرہاوی کو ذی خیوان، حضرت احنفؓ بن قیس کو قبیلہ بنو لیث، حضرت محیصہ بنؓ مسعود کو اہل فدک، حضرت مسعودؓ بن وائل کو خود ان کے قبیلہ، حضرت عمروؓ بن العاص کو ان کے ننہالی قبیلہ بلی، حضرت مالکؓ ابن احمر کو ان کی اپنی قوم، حضرت علاءؓ بن عبید اللہ الحضرمی کو بحرین، حضرت وبرؓ بن یحنس کو یمن، حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو حذیفہ اور خود حضرت علیؓ کو بنو حذیفہ کے علاوہ یمن اسلام کا پیام لے کر بھیجا، (اسوۂ صحابہ جلد ۲ ص ۹ - ۱۵۸ بحوالہ اسد الغابہ)، وہاں کے لوگ ان صحابۂ کرام کے وعظ و پند، ارشاد و ہدایت، حسن سلوک، سیرت و کردار کی بلندی اور پاکیزگی کے بلند نمونے دیکھکر مشرف بہ اسلام ہوتے گئے، انکو تلوار اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوئی، مگر جب جمہوریت اور کمیونزم کے فروغ کے لیے ہر قسم کی جارحانہ اور متشددانہ کارروائیاں کیجا سکتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے پیام رحمت کے ذریعہ سے انسانیت کو سنوارنے کے لیے اگر تلوار بھی اٹھائی جاتی تو آج کے لوگوں کی نظروں میں تعجب خیز نہ ہونی چاہیئے، آپ نے جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو گھر کے صرف چند افراد آپکے ساتھ تھے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی تائید کے علاوہ آپ کا سب سے بڑا سہارا آپ کا اعلیٰ انسانی کردار تھا، بعثت سے پہلے آپ نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ زندگی بھی گذاری، تجارت بھی کی، دوست و دشمن سے تعلقات بھی رکھے، مال و دولت سے بھی واسطہ رکھا، ہر حال میں اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے ہموطنوں کی نظروں میں پاکیزہ اور ارفع دکھائی دیئے، جب نبوت ملی تو آپ کی زندگی جو خلوت میں رہی یا جلوت میں نظر آئی، یا جب حقوق اللہ کی خاطر مسجد میں دیکھے گئے، یا جب حقوق العباد ادا کیے، یا جب میدان جہاد میں متحرک ہوئے یا جب دشمنوں سے صلح کی، تو ان تمام مشاغل کی جزوی تفصیلات آج سب کے سامنے ہیں، ان میں آپ کے حسن اخلاق، حسن معاملہ، حسن سلوک، عدل و انصاف، عدم تشدد، مساوات،

تواضع، راست گفتاری، ایفائے عہد، زہد و ورع، عفو و حلم، دشمنوں سے روادارانہ درگذر، لطف طبع، محبت عام اور رقیق القلبی کے جو نمونے ملتے ہیں انکا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کی زندگی کو ایک آئیڈیل زندگی کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، بیوی سے کیسے پیار اور محبت سے ملنا چاہیئے، بچوں سے شفقت کیسے کیجاتی ہے، بھائیوں سے کیا برتاؤ ہو، عزیز و اقارب کے حقوق ادا کرنے میں کیا کیا چیزیں لازمی ہیں، غریبوں اور مسکینوں کی مدد کس طرح کیجا سکتی ہے، بیماروں کی تیمارداری اور عیادت کس طرح ہو، دولت کا بہترین مصرف کیا ہے، حاکمیت و محکومیت کے کیا فرائض و حقوق ہیں، فرمانروائی کے کیا لوازم ہیں، حیوانات پر رحم کرنا کتنا ضروری ہے، انسانی ضروریات اور حالات کے ساتھ زندگی کیسی ہونی چاہیئے، ان سب کے اعلیٰ نمونے آپ کی حیات طیبہ میں ملتے ہیں جو آپ کے معاصروں اور ہم چشموں کے جسم و روح، ظاہر و باطن، قول و عمل اور زبان و دل کے لیے آئینہ خانہ بنا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اپنی نبوت کی زندگی تو گھر کے چند افراد کے ساتھ شروع کی تھی، لیکن جب آپ نے اپنے آخری حج کے موقع پر اپنا خطبہ دیا تو تقریباً ایک لاکھ جان نثار آپ کے ساتھ تھے، دلوں کی یہ تسخیر ان اخلاقی نیکیوں کی بدولت ممکن ہو سکی جو زندگی کو اخلاق طاہرہ اور اوصاف عالیہ سے معمور کرتی ہیں، آپ نے اعلان کر رکھا تھا کہ خلوت میں مجھ میں جو کچھ دیکھو وہ جلوت میں سب سے برملا بیان کرو اور حجرات کی تاریکی میں دیکھو وہ دن کی روشنی میں ظاہر کرو، جو بند کوٹھریوں میں دیکھو اس کو کھلی چھتوں پر پکار کر کہہ دو، یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیغام نے آپ کے پیروؤں میں وہ نشہ پیدا کر دیا تھا جس کو بقول گاڈفری ہیگنس حضرت عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے، اسی کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا دینی نشہ جاتا رہا، اور وہ اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے، اس کے برعکس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر

کے گرد جمع ہوئے اور آپ کی مدافعت میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کر دیا (اپالوجی فار محمد اردو ترجمہ ص ۶۶-۶۷، خطبات مدراس ص ۸۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں کی جان نثاری

حضرت عیسٰیؑ کے حواری توان کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثاروں نے آپ کی خاطر جو سر فروشی کا ثبوت دیا اس کی مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں نہیں ملے گی، جنگ احد میں جب غلط خبر پھیل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی تو حضرت علیؓ بے تاب ہو کر اپنی تلوار سے دشمنوں کی صف الٹنے میں مشغول ہو گئے کہ وہ آپ کے جسد مبارک تک پہنچ جائیں، حضرت انسؓ کے چچا ابن نضرؓ بھی آگے بڑھے تو دیکھا کہ حضرت عمرؓ مایوس کھڑے ہیں، حضرت ابن نضرؓ کو دیکھ کر بولے اب لڑ کر کیا کریں، رسول اللہ نے تو شہادت پائی، حضرت ابن نضرؓ نے کہا تو آپ کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے، پھر لڑ کر شہادت پائی، یکایک حضرت کعبؓ کی نظر رسول اللہ پر پڑی، وہ چلا اٹھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی زندہ ہیں، پھر تو شمع رسالت کے پروانوں کا ہجوم ہوا، حضرت علیؓ کی تلوار فضا میں بجلی کی طرح کوندنے لگی، زیادؓ بن سکن نے پانچ انصاریوں کے ساتھ لڑ کر اپنے محبوب آقا کے گرد جانیں دیں، ایک صحابی بول اٹھے، رسول اللہ اگر میں مارا گیا تو میں کہاں ہوں گا۔ آپ نے فرمایا "جنت میں"، یہ سنتے ہی بیخود ہو کر اس طرح لڑے کہ شہید ہوئے، دشمنوں نے گھیر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر برسائے۔ ان کی تلواروں سے بھی وار جاری تھا، ایک وار آپ کے چہرۂ مبارک پر بھی پڑا، مغفر کی دو کڑیاں آپ کے چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں، حضرت ابو دجانہؓ آگے بڑھے، جھک کر آپ کے سپر بن گئے، ان کی پیٹھ دشمن کے تیروں کا ہدف بن گئی، تلواروں کا وار حضرت طلحہؓ نے اپنے ہاتھوں پر روکا تو ان کا ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا، رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے صرف اتنی صدا بلند ہوئی اے خدا میری قوم کو بخش دے۔ وہ جانتے نہیں۔ حضرت ابو طلحہؓ نے آپ کی مدافعت میں تیر برسانے

شروع کیے تو ان کی دو تین کمانیں ٹوٹ کر رہ گئیں، انھوں نے اپنے سپر سے آپ کے چہرۂ مبارک کو اوٹ کر لیا، آپ گردن اٹھا کر کچھ دیکھنا چاہتے تو حضرت ابو طلحہؓ کہتے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، آپ کے دشمنوں کے تیر کے لیے یہ میرا سینہ ہے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی آپ کی مدافعت کیلئے تیر اندازی کے لیے آگے بڑھے، دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر آپ کے جان نثار آپ کو ایک پہاڑی کی چوٹی پر لے گئے، قریش کے سردار ابو سفیان نے تعاقب کیا، مگر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ نے اسکو آگے بڑھنے نہ دیا، پھر بھی اس نے حضرت عمرؓ کو للکارا، کوئی جواب نہیں ملا تو بولا "سب مارے گئے" حضرت عمرؓ بول اٹھے او دشمن خدا ہم سب زندہ ہیں، ابو سفیان نے اپنے بت کا نام لے کر کہا اے ہبل تو اونچا رہ صحابہ نے آپ کے حکم سے کہا خدا اونچا اور بڑا ہے، ابو سفیان نے کہا ہمارے پاس عزیٰ ہے، تمھارے پاس نہیں، صحابہ نے جواب دیا، خدا ہمارا آقا ہے اور تمھارا کوئی آقا نہیں، خواتین بھی اس جنگ میں شریک رہیں، حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ کی ماں حضرت ام سلیمؓ زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، جب دشمنوں نے رسول اللہؐ کو گھیر لیا تھا تو حضرت ام عمارہؓ آپ کے لیے سینہ سپر ہو گئیں اور تیر اور تلوار سے دشمنوں کا مقابلہ کیا، حضرت حمزہؓ اس جنگ میں شہید ہوئے، ان کی بہن نے میدان جنگ میں جب ان کی لاش دیکھی تو بولیں خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں، ایک انصاریہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس جنگ میں شہید ہوئے، مگر جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ دیکھا تو بول اٹھی "آپ کے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں"، (ماخوذ از سیرۃ النبی جلد اول ص ۳۸۰-۳۸۵)

یہ جان نثاری اور سر فروشی اسی وقت ممکن ہے جب دلوں پر حکمرانی کیجائے، یہ صحابۂ کرام زیادہ تر اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، لیکن آپ کی ذات مبارک سے ان کو جو گرویدگی اور شیفتگی پیدا ہوئی وہ اس روادارانہ محبت و شفقت کا جلوہ تھا جو ان کو آپ کی ذات مبارک میں ہر لمحہ اور ہر آن دکھائی دیتا، حضرت عمرؓ کی محبت میں تو ایسا والہانہ پن رہا کہ جب ۱۱ھ میں آپ کا

وصال ہوا، اس کی خبر حضرت عمرؓ کو دی گئی تو انھوں نے اپنی تلوار کھینچ لی، اور بولے کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی تو اس کا سر اڑا دوں گا، اور جب آپ کی میت کو غسل دیا جارہا تھا تو حضرت علیؓ نے آپ کے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، یہ وارفتگی اور محبت اسی وقت ممکن ہے جب کوئی حبیب بنکر دوسروں کو محبوب رکھے، اور محبوب ہوکر دوسروں کا حبیب بنا رہے، یہ حبیبت اور محبوبیت شمشیر و سنان سے نہیں بلکہ دلوں کی تسخیر ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتی ہے،

آج بھی آپ کا بڑے سے بڑا بدباطن معترض آپ کی ازواج مطہرات کی تعداد یا جہاد پر تو تنقید کر بیٹھتا ہے مگر آپ کی سیرت کے کسی اور پہلو پر خردہ گیری کرنے میں اپنے کو بے بس پاتا ہے،

تعدد ازواج تعدد ازواج پر اعتراض ان ہی لوگوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے جو اپنی جنسی جبلت کی تسکین کی خاطر صرف دو چار عورتوں تک اپنے کو محدود نہیں رکھنا چاہتے ہیں، آج کی متمدن دنیا میں کوئی پورا شہر یا پورا ملک قحبہ خانہ بن جائے، یا یورپ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں کوئی اپنی ناجائز ازواج کی تعداد پر فخر کرے اور ان ناجائز ازواج کی ناجائز اولادوں سے پوری ایک کالونی آباد ہوجائے تو اس جنسی بہیمیت پر اعتراض کرنا درست نہیں سمجھا جائیگا، لیکن اگر کہیں جائز تعدد ازواج کی مثال مل جائے تو اس کو نسوانی حقوق کی پامالی قرار دے کر ہر طرف سے احتجاج کی صدا بلند کرنے کو جائز قرار دیا جائیگا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں بعض آپ سے سن میں بہت بڑی، بعض بہت چھوٹی تھیں، تمام ازواج میں صرف حضرت عائشہؓ کا عقد ان کے کنوارپن میں ہوا، بقیہ تمام بیویوں کا عقد ثانی آپ کے ساتھ ہوا آپ نے ان کے ساتھ جو روادارانہ اور مساویانہ برتاؤ کیا یا جس لطف و محبت سے ان کی دلجوئی، خاطرداری اور نازبرداری کی، ان پر نہ صرف ازواج مطہرات کو ناز رہا بلکہ وہ عالم نسوانی کی تاریخ کا بہت ہی اہم باب ہے، آپ نے ان کو زہد و ورع، استغناء، ایثار، فیاضی، رواداری، مہمان نوازی، عزت نفس، صبر و ثبات، رازداری، عفت و عصمت، حسن معاشرت

صلہ رحم، باہمی رعایت، تیمارداری، عزاداری، محبت اولاد، محبت والدین، پرستش یتامی، پرورش اولاد، محبت شوہر، خدمت شوہر کی جو تعلیمات دیں اور ان پر عمل کرکے انھوں نے جو عملی نمونے پیش کیے، اس سے جس طرح نسوانیت کا رتبہ اور درجہ بلند ہوا اس پر آج ہر مسلمان کو فخر ہے کہ اسلام نے عورت اور مرد دونوں کا درجہ یکساں بلند کیا، آج متمدن دنیا عورتوں کو مجلسوں، اپنے گھروں، پارکوں، جلسہ گاہوں میں جا ہے کتنے ہی اپنے کیف و سرور، نشاط و انبساط کا خوبصورت کھلونا بنالے لیکن پاک باطنوں کو رسول اللہؐ کی ازواج مطہرات کی معاشرتی زندگی کے مطالعہ سے جو روحانی سکون ملتا ہے وہ اس تمدن میں نہیں ملتا ہے، جس کے مردوں کے اعصاب پر صرف عورت سوار ہے،

جہاد اسی طرح جہاد پر اعتراض کرنے والے بھی ایسی جنگ لڑنے کے عادی ہوچکے ہیں جس میں غارتگری، خونریزی اور درندگی کی ہولناک ترین مثالیں ملتی ہیں، ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ اور امریکہ میں قوم کے تمام نوجوانوں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا گیا، یورپ ہی کا ایک مورخ اے، جی، گرانٹ نے اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خدا نہ کرے کہ دنیا میں پھر اس سے بڑی فوج وجود میں آئے، چند ہفتے کھلے میدان میں جو جنگ ہوئی تو مغربی محاذ کی فوجوں نے خندقیں کھود لیں، جن کا سلسلہ آئس لینڈ سے سوئٹزرلینڈ تک چلا گیا تھا، ان خندقوں میں جو ایک دوسرے سے بہت کم فاصلے پر تھیں، ہوا میں، زمین کے نیچے اور اوپر لڑائیاں جاری تھیں، جن میں نہ کبھی عارضی طور پر صلح ہوئی اور نہ لڑنے والوں نے آرام کیا، اس جنگ کے متعلق اعداد و شمار پورے طور پر فراہم نہیں ہوئے ہیں، اندازہ لگانے میں بہت اختلاف ہے، مگر اس میں پانچ کروڑ افراد شریک تھے، جن میں سے غالباً اسی لاکھ کام آئے، زخمیوں کی تعداد ان سے دوگنی تھی، یعنی یورپ کے نوجوانوں کی ایک نسل ضائع ہوگئی، جو اگر آج زندہ ہوتے تو یورپ کے مدبر، مذہبی پیشوا، سائنسداں اور فنون لطیفہ کے ماہر ہوتے، یہی مورخ لکھتا ہے

کہ سائنس نے قدرت کے رازہائے سربستہ معلوم کر لیے تھے، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں بنی نوع انسان اس کی ایجادوں کے شکار ہوئے، سائنس ہی کی بدولت ایسے آلات حرب ایجاد ہوئے جن سے لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں، جنگ کے اس پہلو پر عرصۂ دراز تک غور و خوض ہوگا، عدالت انسانی میں سائنس کی حیثیت اس وقت ایک ملزم کی ہے، اسی مورخ کا بیان ہے کہ کسی پیغمبر نے ایسی جنگ کی پیشین گوئی نہیں کی تھی جس میں دنیا کے تقریباً سب ممالک شریک ہوں، (تفصیل کے لیے دیکھو تاریخ یورپ مصنفہ اے، جی، گرانٹ باب ۲۲) یہ جنگ کس لیے لڑی گئی؟ رواداری کا پیام پہنچانے، انسانیت کو سنوارنے، غربت وافلاس کو دور کرنے، سیرت و کردار کے معیار کو بلند کرنے، فضائل و اخلاق کی ترویج اور رذائل اخلاق کو ختم کرنے کے لیے لڑی گئی؟ نہیں، مذکورۂ بالا مورخ اے، جی، گرانٹ کے الفاظ میں اس کے اسباب یہ تھے کہ اسٹریا اور جرمنی جنگ آزمائی پر تلے ہوئے تھے، اس لیے ساری دنیا پر یہ بلائے عظیم نازل ہوگئی، بلقان میں روس اور اسٹریا کی شدید رقابت تھی، روس اور جاپان کی لڑائی کے موقع پر اسٹریا نے جرمنی کی مدد سے روس کو بلقان میں زک دی تھی، سرویا کو اسٹریا اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا، اسٹریا نے ۱۹۱۳ء میں سرویا پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، تو اٹلی نے اس کو رد کردیا، ۱۹۱۴ء میں ایک واقعہ کی بدولت اس کو موقع مل گیا، ۲۸ جون کو سراجیوو میں اسٹریا کا ولی عہد قتل ہوگیا تو حکومت سرویا کی سازش کا شبہ کیا گیا، اسٹریا نے ایک اعلان کے ذریعہ دادرسی چاہی، مگر یہ خود جنگ کا اعلان تھا، روس اسٹریا کے بیہودہ مطالبات پر سرویا کی امداد کرنے پر آمادہ ہوگیا، ادھر جرمنی اسٹریا کی مدد پر تیار ہوگیا، فرانس روس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکتا تھا، اس لیے وہ بھی جنگ میں شریک ہوگیا، برطانیہ کو فرانس کی دوستی کی وجہ سے اس میں شرکت کرنی پڑی، یورپ کے بیشتر لوگ امن و صلح کے خواستگار تھے، لیکن وہ ہلاکت آفریں جنگی مشینوں کے دندانوں کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ (تاریخ یورپ از اے، جی، گرانٹ باب ۲۱)۔ اس جنگ میں جرمنی کو

بری طرح شکست ہوئی، تقریباً پچیس ۲۵ سال کے بعد وہ اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے پھر آگے بڑھا، ایک اور بلائے عظیم دنیا کی دوسری عالمگیر جنگ کی شکل میں نازل ہوئی، اس کی ہولناکیوں کا ذکر آگے آئیگا،

سپہ سالاری کا مثالی نمونہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن کن حالات میں اپنے دشمنوں سے جنگ کی، اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، اگر توحید، رسالت، حق اور صداقت کی ترویج کی خاطر لڑائیاں لڑی بھی گئیں تو یہ ان لڑائیوں سے زیادہ بہتر ہیں جو محض کسی ولیعہد کے قتل یا کسی شکست کے انتقامی جذبے یا سائنس کے تجربات کی آزمائش کی خاطر کیجائیں، اور اگر جمہوریت، قومیت، اشتراکیت اور اشتمالیت کو عقیدہ بنا کر خونریزی اور غارتگری کیجا سکتی ہے، یا ملک کی سرزمین کی حفاظت کی خاطر سرفروشی کا جذبہ ابھارا جاسکتا ہے تو اگر خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات کو عقیدہ بنا کر اسکی ترویج میں جو محاذ آرائیاں ہوئیں تو ان پر طنز اور ملامت کیوں کیجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی لڑنے میں جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی ایک مثالی نمونہ بن سکتا ہے، کتاب الخراج میں ہے کہ آپ نے کبھی کسی قوم سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف اسلام کی دعوت دیے بغیر جنگ نہیں کی (ابن رشد، قوانین جنگ فصل اول) اس کی تصریح اس طرح کی گئی ہے کہ جنگ کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوتے لیکن شروع ہونے سے پہلے دشمنوں کے پاس یہ پیام بھیجا جاتا کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں، اگر وہ اسلام نہیں لاتے تو وہ جزیہ دینا قبول کریں، جس کے بعد عام مسلمانوں کی طرح ان کی جان، عزت، آبرو اور دولت کی بھی حفاظت کیجائے گی، اور اگر اسکے لیے بھی وہ تیار نہ ہوتے تو جنگ کیجاتی، جب لشکر روانہ کیا جاتا تو آپ امیر لشکر اور لشکریوں کو ہدایت دیتے کہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، اللہ کا نام لیکر اللہ کی راہ میں اللہ کا انکار کرنے والوں کے ساتھ جنگ کریں، حملہ کرتے وقت غداری نہ کریں، مثلہ نہ کریں، کسی عورت

بوڑھے، بچے یا خانقاہ نشین کو قتل نہ کریں، لڑائی میں جو مال غنیمت حاصل ہو اس کا ⅘ حصہ ان فوجیوں کے درمیان تقسیم کیا جائے جن کی وجہ سے یہ مال حاصل ہوا ہو، قیدیوں کو ہلاک نہ کریں، ان کو احسان کے طور پر یا فدیہ لیکر چھوڑ دیں،

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود جنگ میں شریک ہوتے تو روانہ ہونے سے پہلے یہ دعا کرتے کہ "خدایا تو سفر کا ساتھی اور گھر کا نگراں ہے، خدایا میں سفر کی ہولناکیوں اور واپسی کی مشکلوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، یا اللہ میرے لیے زمین کو مختصر اور سفر آسان بنا دے"۔ دشمن کے علاقہ میں رات کے وقت پہنچ جاتے، تو رات کو حملہ کرنے کی اجازت نہ دیتے، صبح ہونے پر اگر اذان ہوتی رہتی تو بھی حملہ کو روکے رکھتے، لڑائی شروع ہونے سے پہلے یہ دعا فرماتے "خدایا! تو میرا سہارا اور مددگار ہے، تیرے ہی سہارے سے آگے بڑھتا ہوں اور تیرے ہی سہارے حملہ کرتا ہوں اور تیرے ہی خاطر جنگ کرتا ہوں"، اور جب لڑائی سے واپس ہوتے تو یہ دعا فرماتے "ہم توبہ کرتے ہوئے اللہ کے عبادت گذار بنکر اس کی حمد کرتے ہوئے واپس ہوتے ہیں"، اور جب گھر پہنچ جاتے تو فرماتے، "ہم اپنے رب کی طرف لوٹ آئے، اللہ ہمیں کسی غم سے نہ دوچار کرے"۔ (کتاب الخراج پندرہواں باب، قوانین جنگ فصل ا۔ تفصیل کے لیے دیکھو اردو ترجمہ از محمد نجات اللہ صدیقی)

کیا دنیا اس سے بہتر فوجی سپہ سالار پیش کر سکتی ہے؟

صحابہ کرام کا اسوۂ حسنہ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے تو مخالفوں اور دشمنوں سے حسن سلوک اور لڑائیاں لڑنے میں ان ہی تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کی جو انھوں نے اپنے محبوب رسولؐ سے پائی تھیں۔

حضرت ابو بکرؓ صدیق کی رواداری حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنی عفت، پارسائی، رحمدلی، راست بازی، دیانتداری، معاملہ فہمی، عجز، تواضع، زہد و تقویٰ کی بدولت محبوب بارگاہِ رسول اور محرم اسرار نبوت بن گئے تھے، انھوں نے اپنی زندگی اپنے رسول کے اسوہ کے مطابق ہی گذاری، اسلیے انکے یہاں بھی

عفو و درگذر اور رواداری کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں ہر قسم کی ایذائیں پہنچتی رہیں، ان صبر آزما حالات میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ کا جس طرح ساتھ دیا، وہ بھی سیرت و کردار کا مثالی نمونہ ہے، وہ اپنی دولت و ثروت کے لحاظ سے مکہ میں بہت ممتاز تھے، وہ چاہتے تو اپنے محبوب رسول کے دشمنوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کر سکتے تھے، مگر ان سے جنگ کرنے کے بجائے ان سے برابر نرمی، صلح، رواداری اور آشتی سے پیش آتے رہے، ان ہی کی محبت بھری دعوت پر حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ، حضرت عثمانؓ بن مظعون، حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت ابو سلمہؓ، حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، جنکے زریں کارناموں سے اسلام کی تاریخ بھری پڑی ہے، (تاریخ خمیس ص ۲۸، خلفائے راشدین از حاجی معین الدین ندوی ص ۵، اسوۂ صحابہ جلد اول ص ۱۵۲) وہ آزردہ ہو کر کبھی غصہ یا اشتعال میں انتقام لینے کی فکر نہ کرتے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے، مشرکین اس پر بہت برہم ہوئے، انھوں نے آپ کو اس قدر زدو کوب کیا کہ آپ بیہوش ہو گئے، حضرت ابو بکر صدیقؓ جان نثاری کے لیے آگے بڑھے، ان دشمنوں سے بدلہ لینے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ خدا تم سے سمجھے، کیا تم صرف اس لیے آپ کو قتل کر دو گے کہ آپ ایک خدا کا نام لیتے ہیں، اسی طرح ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن معیط نے اپنی چادر سے آپ کے گلے میں پھندا ڈال دیا، اس وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ پہنچ گئے، انھوں نے اس سے سخت برتاؤ کرنے کے بجائے اس کو آپ سے علحدہ کر کے فرمایا "تم آپ کو قتل کر دو گے جو تمھارے پاس خدا کی نشانیاں لائے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میرا رب اللہ ہے، (خلفائے راشدین از حاجی معین الدین احمد ندوی ص ۶، بخاری باب مالقی النبی صلعم و اصحابہ من المشرکین بمکہ)

حقوق انسانی کی حمایت جب انھوں نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو اپنی پہلی تقریر میں لوگوں

سے مخاطب کرکے کہا کہ اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو، اگر میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت لازم نہیں، تمہارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے، یہانتک کہ دوسروں سے اس کا حق اس کو نہ دلا دوں، اور تمہارا قوی شخص بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہانتک کہ میں اس سے دوسروں کا حق نہ حاصل کروں" (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۱۲، خلفائے راشدین ص ۲۵، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی جلد اول ص ۳۳)

عفو و درگذر کی مثالیں بھٹکے ہوئے کو سیدھی راہ پر لانے، کمزوروں کو حق دلانے اور زبردستوں سے حق حاصل کرنے میں انکی ساری روادارانہ سرگرمیاں رہیں، اپنے عہد خلافت میں مجرموں کے ساتھ بڑی نرمی اور رحمدلی سے پیش آتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اشعث بن قیس نے بھی اور جھوٹے مدعیان نبوت کی طرح اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا، وہ جب گرفتار کرکے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے حاضر کیے گئے تو انھوں نے توبہ کی، حضرت ابوبکرؓ نے نہ صرف ان کو معاف کر دیا بلکہ اپنی ہمشیرہ ام فروہؓ سے انکا نکاح بھی کر دیا، (یعقوبی جلد ۲ ص ۱۴۹، خلفائے راشدین ص ۵۷)

اسی طرح طلیحہ نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا، لیکن جب حضرت ابوبکرؓ کے پاس معذرت لکھ بھیجی تو ان کا دل آئینہ کی طرح صاف ہوگیا اور ان کو مدینہ واپس آنے کی اجازت دیدی (یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۵)

انھوں نے حضرت مہاجرؓ بن امیہ کو یمامہ کا امیر مقرر کیا تو ان کی امارت کے زمانہ میں وہاں دو گانے والی عورتوں میں سے ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گانا گایا اور دوسری نے گانے میں مسلمانوں کو برا کہا، حضرت مہاجرؓ بن امیہ نے سزا میں ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے اور دانت اکھڑوا ڈالے، حضرت ابوبکرؓ کو یہ معلوم ہوا تو سخت برہمی کا اظہار کیا، انکو لکھ بھیجا کہ اگر رسول اللہؐ کی ہجو کرنے والی عورت اسلام کی پیرو ہے تو وہ مرتد ہوگئی، اس کو ارتداد کی سزا ملنی چاہیئے تھی، اور اگر ذمیہ تھی تو اس نے خلاف عہد کیا، لیکن جس عورت نے مسلمانوں

کو برا بھلا کہا اس کو کوئی سزا نہ دینی چاہیئے تھی، کیونکہ اگر وہ مسلمان عورت ہے تو اس کو صرف معمولی تنبیہ کرنے کی ضرورت تھی، اور اگر وہ ذمیہ ہے تو جب اسکے مشرک ہونے کو گوارا کر لیا گیا ہو تو مسلمانوں کو برا کہنے کی کیا سزا ہو سکتی ہے، بہرحال یہ تمہاری پہلی خطا تھی، اس لیے معاف کر دیا جاتا ہے، مثلہ (یعنی جسم کا حصہ کاٹنا) نہایت نفرت انگیز گناہ ہے، صرف قصاص کی حالت میں مجبوراً مباح ہے (خلفائے راشدین ص ۵۹۔ تاریخ الخلفاء ص ۹۶)

جنگ میں انسانی رحمدلی وہ اپنی فوج کو بھی برابر ہدایت دیتے رہتے کہ وہ جہاں داخل ہو وہاں جنگی کارروائی کے علاوہ عام آبادیوں پر کوئی زیادتی نہ ہو، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت رہی، حضرت ابوبکرؓ نے جب شام کی مہم پر لشکر روانہ کیا تو امیر لشکر کو مخاطب کرکے فرمایا:

تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دیا ہے، ان کو چھوڑ دینا، میں تم کو دس وصیتیں کرتا ہوں، کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا، پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا، بکری اور اونٹ کھانے کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا، نخلستان نہ جلانا، مال غنیمت میں غبن نہ کرنا اور بزدل نہ ہو جانا۔ (تاریخ الخلفاء ص ۹۶، خلفائے راشدین ص ۶۱)

غیر مسلموں کے حقوق کی نگہبانی ان کے زمانہ میں جو ممالک فتح ہوئے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اپنی پناہ میں لیکر ان کے حقوق کی نگہبانی کا پورا ذمہ لیا، ذمیوں کو جو حقوق رسول اللہ صلعم نے دیے تھے وہی انھوں نے بھی دیے، جب حیرہ فتح ہوا تو وہاں کے عیسائیوں سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ انکی خانقاہیں اور گرجے منہدم نہ کیے جائیں گے، ان کا وہ قصر نہ گرایا جائیگا جس میں وہ ضرورت کے وقت دشمنوں کے مقابلہ میں قلعہ بند ہوتے ہوں، انکو ناقوس اور گھنٹے بجانے کی ممانعت نہ ہوگی، تہوار کے موقع پر صلیب نکالنے سے روکے نہ جائینگے، کوئی بوڑھا آدمی جو کام سے معذور ہو جائے یا کوئی سخت مرض میں مبتلا ہو کر مجبور ہو جائے یا جو

پہلے مالدار ہو، پھر ایسا غریب ہوجائے کہ خیرات کھانے لگے تو ایسے لوگوں سے جزیہ نہیں لیا جائیگا، اور جبتک وہ زندہ رہیں ان کے اہل وعیال کے مصارف مسلمانوں کے بیت المال سے پورے کیے جائیں، البتہ وہ کسی دوسرے ملک میں چلے جائیں تو ان کے اہل وعیال کی کفالت مسلمانوں کے ذمہ نہ ہوگی، اس معاہدہ میں یہ بھی تھا کہ یہاں کے ذمیوں کو فوجی لباس پہننے کے علاوہ ہر طرح کی پوشاک پہننے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ وہ مسلمانوں سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں، مشابہت سے احتراز کرنے کی ہدایت اس لیے دی گئی کہ مسلمانوں اور ذمیوں میں فرق باقی رکھکر ان کی یعنی ذمیوں کی پوری حفاظت کیجائے، ذمیوں پر یہ بھی لازم قرار دیا گیا کہ وہ مسلمانوں سے دشمنی کا اظہار نہ کریں اور نہ ان کے دشمنوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کریں، اگر وہ ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا ذمہ ساقط ہوجائیگا اور ان کو دی ہوئی امان ختم ہوجائے گی، اور اگر مسلمانوں پر کوئی اور طاقت غالب آجائے تو پھر ذمیوں کو آزادی ہوگی کہ جو کچھ چاہیں کریں، اس معاہدہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ یہ معاہدہ اسی طرح پختہ ہے جس طرح اللہ نے اپنے نبی سے پختہ معاہدہ کرتا ہے، (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶، اردو ترجمہ ص ۲۲ - ۲۴۴، الفاروق جلد دوم ص ۱۴۴، خلفائے راشدین ص ۶۷)

نجران کے عیسائیوں کو مراعات نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدہ کیا تھا، اس کی توثیق وتجدید حضرت ابوبکرؓ صدیق نے یہ تحریر لکھ کر دی کہ ان کی جان، زمین، مال، عبادت، مذہب، ان کے پادری، راہب، ان کی عبادت گاہیں، اور ان کے قبضہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی امان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں ہیں، انھیں نہ کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، نہ کسی تنگی میں مبتلا کیا جائیگا، کسی اسقف کو اس کی اسقفیت اور کسی راہب کی اس کی رہبانیت سے نہیں ہٹایا جائے گا، یہ عہد ان تمام وعدوں کی تکمیل میں کیا جارہا ہے

جو محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کیے تھے۔ (کتاب الخراج از ان باب)

عہد صدیقی میں عیسائی مذہب کا احترام حضرت ابوبکرؓ ہی کے عہد میں حضرت خالدؓ نے عانات کے پادریوں سے بھی اسی طرح کا معاہدہ کیا کہ ان کے گرجے برباد نہ کیے جائیں گے، وہ نماز کے اوقات کے سوا رات دن جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں، اپنے تمام تہواروں میں صلیب نکالیں (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶ اردو ترجمہ ص ۲۴۰) تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت خالدؓ نے جن علاقوں کو فتح کیا وہاں کے غیر مسلم باشندوں سے جو معاہدے کیے ان میں تصریح کے ساتھ یہ درج ہوتا کہ جزیہ کے معاوضہ میں ان کے مال وجان کی حفاظت ہوتی رہے گی، اور جب ان کی یہ حفاظت نہ ہوسکے گی تو ان سے جزیہ نہ لیا جائیگا (تفصیل کیلئے دیکھو تاریخ طبری واقعات سنہ ۱۲ھ)

حضرت عمر فاروقؓ کی رواداری حضرت عمر فاروقؓ عہد رسالت میں اپنی سپہگری، بہادری، جانبازی اور قوت تقریر کے لیے مشہور رہتے، جاں نثاری میں ہر موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست وبازو بنے رہے، آپ بھی ان کو بہت محبوب رکھتے، عشرہ مبشرہ میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے، عدل پروری میں سخت گیری سے کام لیتے، مگر حب رسول اور اتباع سنت کو کونین کی دولت سمجھتے، حق وصداقت کے اظہار کرنے میں پس وپیش نہ کرتے، اسلام کی خاطر ہر چیز کو قربان کرنے پر تیار رہتے، قرابت کا بھی لحاظ نہیں رکھتے، جنگ بدر میں اپنے ماموں عاصی بن ہشام بن مغیرہ کو اپنی تلوار سے ہلاک کیا، اس جنگ کے بعد بہت سے قیدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے گئے تو ان میں قریش کے بہت سے معزز سردار تھے، حضرت ابوبکرؓ کی رائے ہوئی کہ ان سے فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دیا جائے، مگر حضرت عمرؓ نے اپنے جوش ایمانی سے مغلوب ہوکر یہ رائے دی کہ اسلام کے دشمنوں کو سزا دینے میں رشتے اور قرابت کا خیال نہ کیا جائے، ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے، رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے پسند کی

اور فدیہ لیکر سب کو رہا کردیا، جو فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے اور اگر وہ پڑھے لکھے تھے تو ان سے کہا گیا کہ وہ دس دس لڑکوں کو پڑھنا لکھنا سکھادیں، تو انکی رہائی ہو جائے گی، اسی کے بعد کلام پاک کی یہ آیت نازل ہوئی کہ کسی پیغمبر کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، جب تک کہ وہ خوب خونریزی نہ کرے (سورہ انفال ۹، طبری ص ۱۱۵۵، مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۴۶، الفاروق ج ۱ ص ۳۴)

اپنے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ حکومت کے نظم و نسق میں تو بہت ہی سخت اور درشت رہے لیکن ممالک محروسہ کے غیر مسلم باشندوں کے لیے ان کا دل بہت ہی نرم رہا، ان سے ہر طرح کا فیاضانہ، شریفانہ اور روادارانہ برتاؤ کیا، ان کے زمانہ میں حضرت ابو عبیدہؓ کی سپہ سالاری میں شام فتح ہوا تو حضرت ابو عبیدہؓ نے ان سے معاہدہ کیا کہ ان کے گرجے اور خانقاہیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے تہوار میں جھنڈوں کے بغیر صلیب نکالنے کی اجازت ہوگی، حضرت عمر فاروقؓ نے اس معاہدہ کے بعد ان کو لکھ بھیجا کہ مسلمان ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں، نہ ان کو نقصان پہنچائیں، نہ ان کا مال بے وجہ غصب کریں، اور جتنی شرطیں ان سے کیجائیں ان کو پورا کیا جائے، (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶، الفاروق جلد دوم ص ۱۴۰)

جب حضرت ابو عبیدہؓ دمشق سے حمص کی طرف بڑھے تو راستہ میں بعلبک پڑا، یہاں کے باشندوں نے ان سے امان کی درخواست کی، تو انھوں نے ان کی جان و مال اور گرجے کو امان دے کر ان کے لیے یہ تحریر لکھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - یہ امان نامہ فلاں بن فلاں کے لیے اور اہل بعلبک — اسکے رومیوں، اس کے فارسیوں اور اس کے عربوں — کے لیے ہے۔ ان کی جانیں، انکے اموال، ان کے گرجے، ان کی محل سرائیں — خواہ وہ داخل شہر ہوں یا اسکے باہر — اور ان کی چکیاں امان میں ہیں، رومیوں کو اجازت ہے کہ وہ پندرہ میل کے اندر اپنے

مویشی چرائیں اور کسی آباد گاؤں میں ماہ ربیع و جمادی الاولی گذرنے تک نہ اتریں، اسکے بعد جہاں چاہیں اتر سکتے ہیں، ان میں سے جو اسلام لائے گا، اس کے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور اس پر وہی فرائض ہوں گے جو ہم پر ہیں، ان کے تاجروں کو ان شہروں میں سفر کرنے کی اجازت ہے جن سے ہماری صلح ہو چکی ہے، ان میں جو اپنے مذہب پر قائم رہے گا، اس پر جزیہ و خراج ہے، اس پر اللہ شاہد ہے اور اس کی شہادت کفایت کرتی ہے (بلاذری عربی ص ۱۳۶ اردو ص ۸ - ۲۰۷)

شام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو وہاں سے کچھ لوگ نکل کر انطاکیہ پہنچے، اور اس کے حکمران ہرقل کو ایک زبردست فوج لیکر حمص کی طرف بڑھنے کو آمادہ کیا، جہاں حضرت ابو عبیدہؓ اپنے ہمراہیوں اور ان کے متعلقین کے ساتھ سکونت پذیر ہو چکے تھے، حضرت ابو عبیدہؓ کو غنیم کے لشکر جرار کی خبر ملی تو مجلس مشورت منعقد کی جس میں یزید بن ابی سفیان نے رائے دی کہ وہ عورتوں اور بچوں کو شہر میں چھوڑ کر باہر لشکر آرا ہو جائیں، شرجیل بن حسنہ نے اس سے یہ کہکر اختلاف کیا کہ ایسی حالت میں شہر کے عیسائی بچوں اور عورتوں کو مار ڈالیں گے، یا دشمنوں کے حوالے کر دیں گے، یہ سن کر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا تو پھر ہم عیسائیوں کو شہر سے نکال دیں، شرجیل نے اس کی بھی پرزور مخالفت یہ کہکر کی کہ جب ہم نے عیسائیوں کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے اور ان کو شہر میں امن و اطمینان سے رہنے کا حق دیدیا ہے تو نقض عہد کیونکر ہو سکتا ہے، حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنی غلطی تسلیم کرلی، اس کے بعد یہ رائے ہوئی کہ حمص کو خالی کر کے دمشق کو محاذ بنایا جائے، مگر حمص چھوڑنے سے پہلے حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ حکم جاری کیا کہ اب وہ اس کے باشندوں کو دشمنوں سے بچا نہیں سکتے، اس لیے ان سے جو جزیہ یا خراج لیا گیا تھا وہ ان کو واپس کر دیا جائے، کیونکہ جزیہ حفاظت کی خاطر وصول کیا جاتا ہے،

یہ حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو رہی ہے، اس لیے ذمیوں کو ان کی رقم واپس ملنی چاہیے، اس حکم
بعد کئی لاکھ کی رقم واپس کر دی گئی، اس رقم کی روادارانہ واپسی سے وہ بہت متاثر ہوئے فتوح البلدان
میں ہے کہ اس واپسی پر اہل حمص نے کہا، ہمیں تمہاری حکومت اور تمہارا عدل اس ظلم
و جور سے بہت زیادہ محبوب ہے جس میں ہم تمہارے آنے سے قبل مبتلا تھے، ہم ہرقل کی فوج
کی مدافعت کرینگے اور تمہارے عامل کے ساتھ ملکر شہر کی حفاظت کرینگے، سنگدل یہودیوں
نے بھی کہا توراۃ کی قسم ہرقل کا عامل حمص میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک
وہ ہمیں مغلوب نہ کرے اور ہماری تمام کوششیں ضائع نہ ہو جائیں، (فتوح البلدان عربی
جلد اول ص ۱۴۴، اردو ترجمہ جلد اول ص ۲۲۱) جزیہ کی رقم اور مفتوحہ اضلاع میں واپس کر دی گئی
تو وہاں کے لوگ کہنے لگے "خدا تمہیں فتح عطا کرے اور دوبارہ ہم پر حکمران بنا کر واپس لائے
آج اگر تمہاری جگہ رومی ہوتے تو ہمیں کچھ بھی واپس نہ دیتے، بلکہ الٹے ہر وہ چیز چھین لیتے جو
ہمارے پاس باقی رہ گئی ہے اور ہمارے پاس کچھ بھی نہیں باقی نہیں رہتا (کتاب الخراج باب ۱۳
فصل ۶، اردو ترجمہ ۲۱۲، نیز دیکھو الفاروق جلد اول ص ۲۸-۱۲۷، فتوح الشام ازدی ص ۱۳۸)

بیت المقدس فتح ہوا تو حضرت عمرؓ کی موجودگی میں وہاں کے لوگوں سے یہ معاہدہ ہوا:

"یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان
ان کی جگہ، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کیلئے ہے،
اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کیجائیگی نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ انکو یا انکے احاطہ
کو نقصان پہنچایا جائیگا، نہ انکی صلیبوں اور انکے مال میں کچھ کمی کیجائیگی، مذہب کے بارے میں
ان پر جبر نہ کیا جائیگا، نہ ان میں کسی کو نقصان پہنچایا جائیگا، ایلیا میں انکے ساتھ یہودی
نہ رہنے پائیں گے، ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں کو

نکال دیں، ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اسکی جان اور مال کو امن ہے تا آنکہ
وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے، جو ایلیا ہی میں رہنا اختیار کرے تو اس کو بھی امن ہے، اس کو
جزیہ دینا ہوگا، ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان اور مال لیکر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا
چاہے تو ان کو اور انکے گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے، یہانتک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک
پہنچ جائیں، اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا، رسول کا، خلفاء کا، مسلمانوں کا
ذمہ ہے، بشرطیکہ یہ لوگ جزیۂ مقررہ ادا کرتے رہیں، اس تحریر پر گواہ میں خالد بن الولیدؓ
عمرو بن العاصؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ اور معاویہ بن ابی سفیانؓ اور ۱۵ھ میں لکھا گیا
(تاریخ ابو جعفر جریر طبری، فتح بیت المقدس ج ۵ ص ۲۴۰۵، الفاروق جلد ۲ ص ۱۳۶-۱۳۷)

۲۰ھ میں مصر پر اسلام کا جھنڈا لہرایا تو وہاں کے مذہبی پیشواؤں کے سارے حقوق
برقرار رکھے گئے، وہاں کا بطریارک رومیوں کے ظلم سے تیرہ برس تک جلا وطن ہو کر ادھر
ادھر زندگی بسر کر رہا تھا، حضرت عمرو بن العاصؓ نے اس کو تحریری امان دیکر واپس بلایا، اور اسکو
اسکا پرانا منصب عطا کیا (مقریزی جلد اول ص ۴۹۲، الفاروق جلد دوم ص ۱۴۲-۱۴۱)
مصر ہی کے فتح کے موقع پر حضرت عمرو بن العاصؓ نے لڑائیوں کی تلخیاں دل سے
بھلا دیں، جب وہاں کے عیسائیوں نے ان کو اپنے یہاں مدعو کیا تو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ
دعوت میں شریک ہوئے اور پھر ان کو اپنے یہاں جوابی دعوت میں مدعو کیا (الفاروق
جلد اول ص ۱۲۰)

۲۱ھ میں اسکندریہ فتح ہوا تو وہاں حضرت عیسیٰؑ کی ایک تصویر کی ایک آنکھ کو
اسلامی فوج کے کسی لشکری نے اپنے تیر سے پھوڑ ڈالا، عیسائیوں کو سخت تکلیف ہوئی، انہوں
نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس پہنچ کر یہ مطالبہ کیا کہ پیغمبر اسلامؐ کی تصویر بنا کر

انکو دیجائے تاکہ وہ بھی اسکی ایک آنکھ پھوڑ ڈالیں، حضرت عمرو بن العاصؓ نے جواب دیا، تصویر دینے کی کیا ضرورت ہے، ہم لوگ موجود ہیں، تم جس کی آنکھ چاہو پھوڑ ڈالو، پھر اپنا خنجر ایک عیسائی کے ہاتھ میں دیکر اپنی آنکھیں سامنے کر دیں، یہ سنکر عیسائی کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا، اپنے دعویٰ سے یہ کہکر باز آیا کہ جو قوم اس درجہ دلیر، فیاض اور بے تعصب ہو اس سے انتقام لینا سخت بے رحمی اور بے قدری ہے، یہ واقعہ مصر کے ایک عیسائی بشپ سعید بن البطریق نے اپنی تاریخ مصر میں لکھا ہے جو چھپ چکی ہے، یہ مصنف ۳۴۸ھ میں موجود تھا، اس واقعہ کو مولانا شبلی نے جنوری ۱۹۰۳ء کی ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں بھی بیان کیا ہے (خطبات شبلی ص ۴۲، ۴۳)

اسکندریہ ہی کی فتح کے موقع پر کثرت سے قبطی اور رومی گرفتار ہوئے، حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے ان کے متعلق رائے پوچھی تو انھوں نے لکھ بھیجا کہ ان قیدیوں کو اختیار ہے کہ مسلمان ہو جائیں یا اپنے مذہب پر قائم رہیں، اگر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو انکو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں، ورنہ جزیہ دیکر وہ پناہ میں آجائینگے، اس حکم کے بعد تمام قیدی ایک جگہ جمع کیے گئے، عیسائی سرداروں کو بھی بلا لیا گیا، ہزاروں قیدی [illegible] کے بیچ میں حضرت عمر فاروقؓ کا فرمان پڑھا گیا، ان قیدیوں میں سے جو اسلام قبول کرتا تو مسلمانوں کی طرف سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا، اور جب کوئی اپنی عیسائیت برقرار رکھنے کا اعلان کرتا تو عیسائیوں میں مبارکباد کی صدا بلند ہوتی (طبری جلد ۵ ص ۳-۲۵۸۲۔ الفاروق جلد اول ص ۱۹۶ - ۱۹۵)

حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایت رہی کہ مفتوحہ علاقوں میں وہاں کے لوگوں کے مال، جان اور مذہب کو پورا امان دیا جائے، ۲۲ھ میں آذربائیجان کی تسخیر ہوئی تو وہاں کے باشندوں سے جو معاہدہ ہوا اس میں اس کی تصریح کی گئی کہ وہ انکے مال، جان، مذہب اور

شریعت کو امان ہے، (طبری ج ۵ ص ۲۶۶۲، الفاروق ص ۱۴۲) اسی طرح حذیفہ بن الیمانؓ نے ماہ دینار والوں کو جو تحریر لکھی یا جرجان والوں سے جو معاہدہ کیا گیا اس میں بھی اس کی پوری وضاحت کی گئی ہے کہ ان کا مذہب نہ بدلا جائیگا، ان کے مذہبی امور میں دست اندازی نہ کیجائیگی، انکی شریعت میں کوئی تغیر نہ کیا جائیگا۔ (طبری ج ۵ ص ۲۶۶۲، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۲)

۲۳ھ میں سیستان فتح ہوا تو وہاں کے باشندوں سے اس شرط پر صلح ہوئی کہ انکی تمام آراضی خمس سمجھی جائے، مسلمانوں نے اس شرط کو منظور کر کے یہ نمونہ پیش کیا کہ جب مزروعات کی طرف نکلتے تھے تو تیزی سے گذر جاتے کہ زراعت چھو تک نہ جائے (الفاروق جلد اول ص ۱۸۳، طبری ج ۵ ص ۲۷۰۵)

ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک بوڑھے اندھے سائل کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو، اس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں، پھر پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو، وہ بولا بوڑھا ہو کر محتاج ہو گیا ہوں، جزیہ کی بھی رقم ادا کرنی ہوتی ہے، یہ سنکر حضرت عمرؓ اس کو اپنے گھر لے گئے اور گھر سے لاکر کچھ دیا، پھر بیت المال کے خازن کو بلا کر حکم دیا کہ اس کا اور اسی کی طرح اور مجبور لوگوں کا خیال رکھو، یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ ایسے لوگوں سے جوانی میں جزیہ وصول کر کے فائدہ اٹھایا جائے اور وہ بوڑھے ہوں تو انکو بے سہارا چھوڑ دیا جائے، پھر یہ آیت پڑھی انما الصدقات للفقراء والمساکین۔ اس میں فقراء سے مراد مسلمان فقراء ہیں اور مسکینوں میں اہل کتاب بھی شامل ہیں، اس کے بعد اس یہودی اور اسی طرح کے اور معذور اہل ذمہ مسکینوں کا جزیہ معاف کر دیا (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)

ایک بار حضرت عمر فاروقؓ شام سے واپس آرہے تھے تو ایک ایسی جگہ سے گذرے جہاں کچھ لوگ دھوپ میں کھڑے کر دیے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو جزیہ دینے کی استطاعت نہیں، مگر ان سے واجب الادا

جزیہ وصول کرنا ضروری ہے، یہ سنکر حضرت عمرؓ نے فرمایا، ان کو چھوڑ دو، ان پر انکی برداشت سے زیادہ
بار نہ ڈالو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ لوگوں کو عذاب نہ دو، جو لوگ دنیا میں
انسانوں کو عذاب دیتے ہیں انکو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عذاب دیگا (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)

حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی پوری نگرانی کی کہ غیر مسلموں اور ذمیوں پر مسلمان غاصبانہ
قبضہ نہ کریں، جب ممالک فتح ہونے لگے تو حضرت ابو عبیدہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجا کہ
مسلمان ان سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ مفتوحہ علاقے کے شہر، وہاں کی زمین، کھیت اور درخت
وغیرہ ان کے درمیان تقسیم کر دیے جائیں، اسکے جواب میں حضرت عمرؓ نے سورہ الحشر اور توبہ کی
بعض آیتوں سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ وہاں کے باشندوں سے جزیہ وصول کر لینے
کے بعد مسلمانوں کا کوئی اور حق نہیں رہ جاتا اور نہ کسی تعرض کی گنجائش باقی رہتی، مسلمانوں
کو یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ مفتوحہ علاقہ کی زمینوں کو آپس میں تقسیم کر لیں، وہاں کے باشندے
بدستور سابق وہاں کی زمین کاشت میں لاتے رہیں، کیونکہ وہ اس کام سے زیادہ واقف ہیں اور
اس کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں، وہ غلام نہ بنائے جائیں،
مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے، ان کو کسی طرح نقصان پہنچانے اور ان کا مال کھانے سے روکو (کتاب
الخراج باب ۴ فصل ۱، باب ۱۳ فصل ۲)، حضرت عمر فاروقؓ نے تو غیر مسلموں سے زمینوں کا خریدنا
بھی ناجائز قرار دیا تھا، ان پر مالگذاری عائد کرتے وقت ہدایت کرتے کہ جمع سخت مقرر نہ کیجائے،
ان سے پہلے استصواب بھی کر لیتے، عراق کا بندوبست ہونے لگا تو عجمی رئیسوں کو بلا کر ان سے
مشورے کئے، مصر کے انتظام میں مقوقس کی رائے طلب کی (مقریزی جلد اول ص ۷۴، الفاروق
جلد دوم ص ۱۲۵)

عراق، مصر اور شام کے دفتر مالگذاری کا حساب کتاب وہاں کی زبانوں میں رکھا جاتا، اسلیے

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں وہاں کے حساب کتاب کرنے والے مجوسی، عیسائی یا قبطی تھے،
ان کے ساتھ حضرت عمرؓ کے حکم کے مطابق عاملوں کا اچھا سلوک رہتا، (الفاروق ج ۲ ص ۲۶۲)

حضرت عمرؓ کو اپنے بستر مرگ پر بھی ذمیوں کا خیال رہا، انھوں نے فرمایا میں اپنے بعد آنے والے
خلیفہ کو ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہوں، ان سے جو عہد کیا جائے اس کی
پابندی کیجائے، ان کے دشمنوں کے خلاف ان کا دفاع کیا جائے، اور ان پر انکی برداشت سے
زیادہ بار نہ ڈالا جائے (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۲)

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ اگر محض روادار ہوتے تو وہ نہ کامیاب حکمراں
اور نہ کامراں فاتح ہوتے، جہاں انھوں نے اپنی رواداری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے وہاں انکے
مزاج کی تندی، تیزی اور سختی بھی مشہور رہی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر نیام سے تلوار
نکالنے کے لیے برابر تیار رہتے، ایک صحابی ابو حذیفہؓ اور ایک شخص خویصرہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے گستاخانہ باتیں کیں تو حضرت عمرؓ سے برداشت نہ ہوسکا تلوار نکال کر ان کا سر قلم کرنے کیلئے تیار
ہوگئے مگر آپ نے ان کو روکا (ابن سعد قسم اول جزء ۴ تذکرہ عباس ص ۴، خلفائے راشدین ص ۱۶۲، ۱۶۸)
آپ نے ازواج مطہرات سے آزردہ ہو کر کچھ دنوں علیحدگی اختیار کر لی تھی، تو حضرت عمرؓ بے چین ہو کر
اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ کی گردن مارنے کے لیے تیار ہوگئے تھے (فتح الباری ج ۹ ص ۲۵۱) انکی سختی کی وجہ سے
بقول حضرت علیؓ عرب کا سرکش سے سرکش اونٹ بلبلا اٹھا تھا، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار عامل اور حاکم ان کے
قابو میں رہا، کوئی خود سری کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، حضرت عمار بن یاسرؓ اپنے زہد و اتقاء کے لحاظ سے بڑے
کے صحابی سمجھے جاتے تھے لیکن سیاست اور تدبر میں انکا پایہ اونچا نہ تھا، حضرت عمرؓ نے انکو کوفہ کا حاکم مقرر کیا لیکن
وہ اپنے فرائض منصبی میں ناکام رہے تو بلا تکلف انکو معزول کر دیا کہ وہ اپنے کو اس عہدہ کا موزوں ثابت
نہ کر سکے، حضرت سعد بن ابی وقاص کوفہ کے حاکم ہوئے تو اپنے لیے ایک محل بنوایا، حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے

ان کی ڈیوڑھی میں آگ لگوادی کہ اس سے اہل حاجت کو پہنچنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی (ابن اثیر ج ۲ ص ۴۰)

حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو شام سے معزول کرکے حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو وہاں کا حاکم مقرر کیا تو حضرت خالدؓ نے وہاں کے عوام کے سامنے ایک تقریر کی جس میں یہ کہا کہ امیر المومنین نے مجھے شام کا حاکم بنایا، جب یہاں کے معاملات سدھر گئے، اسکے محاصل آسانی سے وصول ہونے لگے تو مجھے معزول کردیا، اور دوسرے کو مجھ پر ترجیح دی، یہ سنکر ایک سپاہی نے کہا صبر کیجئے، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہوسکتا ہے، حضرت خالدؓ نے کہا جبتک ابن خطاب زندہ ہیں، فتنہ کا دور نہیں آسکتا، حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے فرمایا، میں خالد کو ضرور معزول کروں گا تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ اپنے دین کی مدد اللہ خود کرتا ہے نہ کہ خالد (کتاب الخراج باب ۱۳ فصل ۶)

وہ عاملوں کی خطاؤں کی سخت گرفت کرتے، ایک بار عوام سے مخاطب ہوکر فرمایا، خدا کی قسم میں اپنے عاملوں کو تمہارے یہاں اس لیے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ تمہارے منہ پر تم کو چانٹے ماریں، تمہارا مال چھین لیں، وہ اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ تم کو تمہارا دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں، اگر کوئی عامل کسی سے دین اور سنت سے ہٹکر سلوک کرے تو میں اس سے مظلوم کا بدلہ لیکر رہونگا، یہ سنکر عمرو بن العاصؓ کہہ اٹھے کہ اگر کوئی مسلمان عامل اپنی رعایا کی تادیب کرے تو کیا اس سے بھی قصاص لیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے جواب دیا، ہاں میں اس سے ضرور قصاص لوں گا، میں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آپ سے قصاص دلواتے دیکھا ہے (کتاب الخراج باب ۱۲ فصل ۱)

(باقی)

آلِ مقسم قیقانی سندھی

امام ابن عُلیہ بصری اور دیگر علماء و محدثین

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

یہ واقعہ ابن علیہ کے انتقال سے چند ماہ پیشتر کا ہے، یہ گفتگو خلیفہ محمد الامین کے دربار میں ہوئی تھی، جو اپنے والد ہارون الرشید کے انتقال پر جمادی الاولیٰ ۱۹۳ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اسی سال ۱۳ ذوقعدہ ۱۹۳ھ میں ابن علیہ کا انتقال ہوا، یہ ابن علیہ کا عقیدہ نہیں تھا، اتفاق سے ایک بات ان کی زبان سے نکل گئی تھی جس سے فوری تنبیہ پر انھوں نے رجوع کر لیا تھا لیکن مخالفین نے ان کی بات پکڑلی اور اعتراضات کا ایک دفتر تیار کر دیا، خطیب بغدادی، حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر جیسے جلیل القدر اصحاب نے اس جملہ کو لغزش زبان قرار دیا ہے، اور ابن علیہ کی ثقاہت اور صحتِ اعتقاد کی تصدیق کی ہے[1]، حافظ ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "ان کی ثقاہت میں کوئی نزاع نہیں ہے، ان کے منہ سے بے خیالی میں ایک بات نکل گئی تھی، اس سے کیا ہوتا ہے، عبد الصمد بن یزید مردویہ کا بیان ہے کہ "میں نے ابن علیہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں[2]، خطیب نے

---

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۷، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۸ [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۰۲

بھی عبد الصمد بن یزید مردویہ سے اسی طرح کا بیان نقل کیا ہے[1]۔

اس کے باوجود بعض محدثین کا دل ابن علیہ کی طرف سے صاف نہیں ہوا، ابوبکر یحیٰی ابن ابو طالب کا بیان ہے کہ ہم لوگ ابو سلمہ منصور بن سلمہ خزاعی کی مجلس میں موجود تھے، انھوں نے زہیر بن معاویہ سے ایک حدیث بیان کرنی چاہی، مگر اتفاق سے منہ سے "حدثنا اسمٰعیل بن علیۃ" نکل گیا، فوراً کہا میں زہیر کہنا چاہتا تھا، اسمٰعیل ان کے مانند کیسے ہو سکتے ہیں، مرتکب گناہ اور بے گناہ یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں، خدا کی قسم اسمٰعیل بن علیہ سے میں نے توبہ کرائی ہے[2]،

ابن حجر نے اس واقعہ کو نقل کرکے منصور بن سلمہ خزاعی کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

قرأت بخط الذھبی ھذا من الجرح المردود[3]	میں نے امام ذہبی کے ہاتھ کی تحریر پڑھی ہے کہ یہ جرح قابل رد ہے۔

فضل بن زیاد کا بیان ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ وہیب اور ابن علیہ میں سے آپ کسے پسند کرتے ہیں، اور جب ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو آپ کس کے قول کو ترجیح دیں گے؟ امام احمد نے کہا کہ وہیب مجھے زیادہ پسند ہیں، عبد الرحمٰن بن مہدی اسمٰعیل بن علیہ کے مقابلہ میں وہیب کو زیادہ پسند کرتے تھے، میں نے پوچھا ابن مہدی کیا وہیب کو حفظ کی بنا پر پسند کرتے تھے؟ فرمایا ہر اعتبار سے، اسمٰعیل ابن علیہ مرتے دم تک اپنی بات (قضیہ خلق قرآن) کی وجہ سے کم حیثیت رہے، میں نے کہا کیا انھوں نے لوگوں کے سامنے توبہ اور رجوع نہیں کیا ہے؟ امام احمد نے کہا ہاں مگر اس واقعہ کے بعد آخری دم تک وہ محدثین سے عداوت رکھتے رہے، پھر امام احمد امین کے دربار کا واقعہ نقل کرکے بار بار

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۲۹ [2] ایضاً ص ۲۳۸ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۹

اسمٰعیل کے بارے میں کہتے رہے: جعلنہ فلا اعزلنۃ من عالم، جعلنہ فلا اعزلنۃ من عالم، گویا وہ اسمٰعیل کے اس جملہ کو دہراتے رہے جو انھوں نے خلیفہ امین سے معذرت اور رجوع کرتے ہوئے کہا پھر امین کے بارے میں بار بار یہ جملہ دہراتے رہے:

لعل اللہ ان یغفر لہ بھا	شاید اللہ اسکی وجہ سے اسکی مغفرت فرمادے،

پھر امام صاحب نے اسمٰعیل بن علیہ کے بارے میں کہا وہ ثبت ہیں[1]۔

لیکن امام احمد کی طرف اس بات کی نسبت محلِ نظر ہے، وہ ابن علیہ کے عقیدتمند شاگرد تھے، خطیب نے ان کے صاحبزادے عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ

سمعتُ ابی یقول: فاتنی مالکؒ فاخلف اللہ علیّ سفیان ابن عیینۃ، وفاتنی حماد بن زید فاخلف اللہ علیّ اسمٰعیل بن علیۃ[2]	میں نے والد صاحب کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے امام مالک نہ مل سکے تو اللہ تعالیٰ نے اسکے بدلے مجھے سفیان بن عیینہ اور حماد بن زید نہ مل سکے تو اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل بن علیہ کو عطا فرما

اسی طرح ابو سلمہ منصور بن سلمہ خزاعی کا ابن علیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ "میں نے ان سے توبہ کرائی ہے، مگر مرتکب گناہ غیر مرتکب گناہ کے مانند نہیں ہو سکتا"۔ روایت و درایت دونوں اعتبار سے نقد و جرح کے لائق ہے، چنانچہ امام ذہبی اور حافظ ابن حجر نے اس بیان کو مجروح اور قابل رد قرار دیا ہے[3]،

اصحاب و تلامذہ اصحاب و تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، ان کے بعض شیوخ و اساتذہ اقران و معاصرین اور ان سے زیادہ سن رسیدہ ائمہ نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ

[1] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۹ [2] ایضاً ص ۲۳۴ [3] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۹

ان کے اساتذہ میں شعبہ اور ابن جریج، معاصرین میں بقیہ بن ولید، حماد بن زید، سن رسیدہ افراد میں امام ابراہیم بن طہمان، مشاہیر اسلام اور ائمہ دین میں امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا نام لیا جاتا ہے[1]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کے حالات کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے شعبہ، ابن جریج، حماد بن زید، عبد الرحمٰن بن مہدی، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین، اسحٰق بن راہویہ اور ابوبکر بن شیبہ کا نام کافی ہے،

تصانیف ذہبی نے لکھا ہے کہ ۱۴۳ھ میں علمائے اسلام نے فقہ، حدیث، تفسیر و سیر وغیرہ علوم کی تدوین و تالیف شروع کی، ابن جریج نے مکہ مکرمہ میں، سعید بن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ وغیرہ نے بصرہ میں، اوزاعی نے شام میں، امام مالک اور ابن اسحاق نے مدینہ منورہ میں، معمر نے یمن میں امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری نے کوفہ میں تدوین کا کام کیا، اس کے تھوڑے دنوں بعد ہشیم، لیث، ابن سعد، ابن لہیعہ، ابن مبارک، ابو یوسف، ابن وہب نے کتابیں لکھیں، ان دینی علوم کے علاوہ عربی زبان و ادب، لغت اور تاریخ میں بھی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا[2]

اسی عہد کے دور میں امام ابن علیہ نے حدیث، فقہ اور تفسیر میں کتابیں تصنیف کیں، انکی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ امام شعبہ انھیں سید المحدثین اور ریحانۃ الفقہا کہتے تھے۔ ان کی تصانیف میں حدیث و فقہ کا بہترین امتزاج تھا، ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں کتاب التفسیر، کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب المناسک ان کی چار کتابوں کا ذکر کیا ہے[3] لیکن اب یہ کتابیں ناپید ہیں، اور علمائے اسلام کی دوسری بے شمار کتابوں کی طرح صرف انکے نام باقی رہ گئے ہیں، البتہ کتب حدیث و رجال وغیرہ میں ان کے آراء و اقوال ملتے ہیں، جو

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۷۵ [2] تاریخ الاسلام ج ۶ ص ۳ [3] الفہرست ص ۳۲۷

ممکن ہے ان کی ان ہی کتابوں سے ماخوذ ہوں صدر اول کے علماء میں ابوبکر جعفر بن محمد ابن عبد اللہ ابہری مالکی نے متعدد مسائل میں ان سے اختلاف کیا تھا، اس سلسلہ میں ایک کتاب مرتب کر رہے تھے، مگر یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی[1]

وفات امام ابن علیہ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے تھے، کم و بیش ۱۶۹ھ تک وہیں رہے اور ہارون رشید کے دور خلافت میں ۱۶۹ھ سے ۱۹۳ھ تک بغداد میں اہل و عیال کے ساتھ زندگی بسر کی، تاریخ وفات میں اختلاف ہے، لیکن مشہور قول یہ ہے کہ سہ شنبہ کے دن ۱۳ ذی قعدہ ۱۹۳ھ میں بغداد میں فوت ہوئے اور دوسرے دن مقابر عبد اللہ ابن مالک میں دفن کیے گئے، نماز جنازہ ان کے صاحبزادے ابراہیم بن اسمٰعیل ابن علیہ نے پڑھائی، جس دن ابن علیہ کا انتقال ہوا وکیع بن جراح بغداد میں موجود تھے[2]

خطیب نے معمر بن فضیل کا بیان نقل کیا ہے کہ ۱۹۳ھ میں ہم لوگ مکہ مکرمہ میں تھے، راشد الخنان نے ہم کو بتایا کہ ہم نے پنجشنبہ ۲۵ یا ۲۶ ذی قعدہ کو ابن علیہ کو دفن کیا اور نو دن کی مسافت طے کر کے بغداد سے مکہ مکرمہ پہنچے، اس کے بعد خطیب نے یعقوب بن شیبہ کا قول نقل کیا ہے کہ ابن علیہ سہ شنبہ ۱۳ ذی قعدہ ۱۹۳ھ میں فوت ہوئے[3]، خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں ان کی وفات ۱۹۴ھ میں بتائی ہے[4]، بعض دوسرے علماء نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابن ندیم نے ابن علیہ کی پیدائش ۱۱۶ھ میں لکھی ہے اور ۱۹۳ھ میں ان کی وفات کے وقت عمر تراسی سال چند ماہ بتائی ہے[5]، لیکن یہ حساب کے خلاف ہے، ۱۱۰ھ ہی میں پیدائش مانی جائے تب ۱۹۳ھ میں ۸۳ سال ہوں گے۔

اولاد و احفاد امام ابن علیہ صاحب اولاد تھے، ان کے تین صاحبزادوں کے نام اور حالات معلوم

---

[1] الفہرست ص ۲۸۳ [2] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۳۲۶ [3] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۹، ۲۴۰ [4] تاریخ خلیفہ ج ۲ ص ۵۳، [5] الفہرست ص ۳۱۷

ہو سکے ہیں، ایک ابراہیم جنھوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی، دوسرے حماد جو مشہور محدث تھے، اور تیسرے محمد یہ بھی محدث تھے، ان کے مختصر حالات درج ذیل ہیں،

ابراہیم بن اسمٰعیل بن علیہ بغدادی | یہ بھی اپنے والد کی طرح ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہیں، انکی پیدائش کے بارہ میں ابن ندیم نے تصریح کی ہے کہ ۱۵۲ھ میں ہوئی تھی،[۱] وہ بصرہ میں پیدا ہوئے پھر اپنے والد کے ساتھ بغداد چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی، ابن سعد نے اسماعیل بن علیہ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کی نماز جنازہ ان کے لڑکے ابراہیم بن اسمٰعیل نے پڑھائی، حالانکہ اس دن بغداد میں وکیع بن جراح موجود تھے،[۲]

خطیب نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ علمائے متکلمین میں سے تھے، اور خلق قرآن کے قائل تھے، بغداد اور مصر میں ان کے اور امام شافعی کے درمیان جو مناظرے ہوئے ہیں، اسکی تفصیل میں نے دیکھی ہے،[۳]

ابراہیم بن اسمٰعیل نے اپنے والد کے علاوہ اور کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اسکا پتہ نہیں چلتا، البتہ بحر بن نصر خولانی یٰسین بن ابی زرارہ وغیرہ نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے، آخر عمر میں وہ بغداد سے مصر جا کر باب الضوال میں آباد ہو گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے،

خطیب نے امام شافعی سے ان کے اختلافات کے واقعات نقل کیے ہیں، یہ مباحث اجماع اور خبر واحد کے سلسلہ میں تھے، اسی طرح خلق قرآن کے مسئلہ میں بھی امام احمد اور دوسرے محدثین ان کے خیالات کو ناپسند کرتے تھے، یہ بھی اس زمانہ کا بڑا نازک مسئلہ تھا، اور محدثین اس بارہ میں بڑے ذکی الحس تھے، ذرا سا اختلاف بھی ان کو ناگوار ہوتا تھا، ابراہیم کو علم کلام سے دلچسپی تھی اور ان مسائل کو کلامی رنگ میں پیش کرتے تھے، اس لیے وہ لوگ انھیں راہ صواب

۱؎ الفہرست ص ۳۱۸ ۲؎ طبقات ابن سعد ج، ص ۲۲۶ ۳؎ تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۰

سے الگ سمجھتے تھے، بعد کو یہ مسائل منقح ہو گئے، لیکن ان کے متعلق تذکروں میں محدثین کی مخالفانہ رائیں درج ہیں، جنھیں پڑھ کر سادہ مزاج قاری الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے، بات یہ ہے کہ معتزلہ کی ضرورت سے زیادہ عقلیت پسندی اور یونانی فلسفہ سے غیر معمولی تاثر عام طور سے مسلمانوں کو ناپسند تھا، پھر جب مامون اور معتصم کے دور میں حکومت کی طاقت بھی معتزلہ کے ساتھ ہو گئی اور امام احمد اور دوسرے ائمہ حدیث پر بہت زیادہ مظالم کیے گئے تو دیندار مسلمانوں کی ناراضی اور بڑھی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس نے ذرا بھی ان مباحث میں لب کشائی کی مسلمانوں کی نظر سے گر گیا، ابراہیم سے برہمی کی یہی وجہ ہے، رفتہ رفتہ جب حالات اعتدال پر آئے اور اشاعرہ نے اس میدان میں قدم رکھا تو صورت حال بدلی، بہر حال ابراہیم نے بغداد اور مصر میں تقریباً چالیس سال تک اس زمانہ کے ذوق کے مطابق دینی علوم کے پڑھنے پڑھانے میں گزارے، اس مدت میں صدہا طلبہ نے ان سے استفادہ کیا مگر ان کے اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ کے نام بھی کتابوں میں نہیں ملتے ہیں، البتہ خطیب نے ان کے دو شاگردوں بحر بن نصر خولانی اور یٰسین بن ابی زرارہ کی نشاندہی کی ہے، یٰسین کے حالات تو نہیں ملتے مگر بحر بن نصر خولانی متوفی ۲۶۷ھ کو تذکرہ نویسوں نے ثقہ محدث بتایا ہے، انھوں نے ابراہیم کے علاوہ امام شافعی ابن وہب، اشہب بن عبدالعزیز، اسد بن موسیٰ، عبدالرحمٰن بن زیاد رصاصی، خالد بن عبدالرحمٰن خراسانی سے بھی حدیث کی روایت کی ہے، اور ان سے ابن ابی حاتم رازی نے براہ راست اور امام نسائی نے ایک واسطہ سے روایت کی ہے، ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

وکان احد الثقات الاثبات — وہ ثقات و اثبات میں سے تھے، امام

روی النسائی فی جمعہ — نسائی نے اپنی کتاب میں مسند مالک

لمسند مالك عن رجل عنه[1] کے حصہ میں ان سے روایت کی ہے ۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ابراہیم بن اسمٰعیل کے اس شاگرد سے ان کی حیثیت کا علم ہو جاتا ہے، اور ان کے بارہ میں مخالفانہ خیالات کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے ۔

تصانیف | ابراہیم بن اسمٰعیل ابن علیہ صاحب تصانیف تھے، ان کی کتابیں فقہی مباحث پر تھیں جن میں بحث و تمحیص کا رنگ غالب تھا اور وہ اپنے آراء و اقوال پر دلائل لانے میں مشہور تھے، داؤد ابن علی اصفہانی نے ان کی ایک کتاب نقد لکھنے کے سلسلہ میں ان کے حجج و دلائل کا اعتراف کیا ہے، اور خطیب نے حسب ذیل الفاظ میں ان کے اس طرز استدلال کی طرف اشارہ کیا،

وله مصنفات فی الفقه   فقہ میں ان کی تصنیفات ہیں جن میں

تشبه الجدل[2]   بحث و مناظرہ کا رنگ ہے ۔

وفات | ابراہیم بن اسمٰعیل بن علیہ نے آخر عمر میں بغداد سے مصر جا کر باب الضوال میں اقامت اختیار کر لی تھی، وہیں ذی الحجہ ۲۱۸ھ میں ان کی ۶۴ سال کی عمر میں وفات ہوئی، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصر کے بجائے انھوں نے بغداد میں وفات پائی،

حماد بن اسمٰعیل بن علیہ | دوسرے صاحبزادے کا نام حماد بن اسمٰعیل ہے، یہ بھی اپنے باپ اور بھائی کی طرح ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہیں، اپنے والد اسمٰعیل بن علیہ اور وہب ابن جریر بن حازم سے روایت کی، اور ان سے امام مسلم، امام نسائی، عثمان بن خرزاذ، محمد بن اسحٰق صاغانی، یعقوب بن سفیان، محمد بن عباس کابلی، محمد بن عبدوس بن کامل سراج، اور احمد بن ابو عوف بزوری وغیرہ نے روایت کی ہے، امام نسائی نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے،

[1] کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ قسم ۱ ص ۱۹ [2] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳

اور ابن حبان نے ثقات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۲۴۲ھ میں بغداد میں فوت ہوئے، خطیب نے ان کی سند سے حضرت عطیہ قرظی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے[1]،

محمد بن اسمٰعیل بن علیہ | تیسرے صاحبزادے ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل تھے، ان کو ابوبکر بصری بھی کہتے ہیں، یہ بھی اپنے خاندان والوں کی طرح ابن علیہ کی کنیت سے مشہور ہیں، خطیب نے حماد بن اسمٰعیل بن علیہ کے بیان میں ان کا نام لیا ہے، انھوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی، ابو عامر عقدی، عثمان بن عمر بن فارس، اسحاق بن یوسف ازرق، جعفر بن عون، حجاج بن محمد، سعید ابن عامر، ابو نصر، وہب بن جریر، یونس بن محمد، محمد بن بشر عبدی، یعلی بن عبید، یزید بن ہارون، عبداللہ بن بکر سہمی، علی بن حفص مدائنی، مکی بن ابراہیم، ابو نعیم، محمد بن عبداللہ انصاری، وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے،

اور ان سے امام نسائی، ابو زرعہ دمشقی، ابراہیم بن دحیم، ابراہیم بن متویہ، محمد بن عبداللہ ابن عبدالسلام، مکحول، ابو بشر دولابی، عبداللہ بن احمد بن ابی الحواری، ابوالعباس محمد بن جعفر ابن محمد بن ہشام بن بلاس، ابوالفضل احمد بن عبداللہ بن نصر بن ہلال سلمی، ابوالحسن احمد ابن عمر بن جوصاء، اور دوسرے محدثین نے روایت کی ہے،

امام نسائی نے ان کو حافظ ثقہ بتایا ہے، دارقطنی نے اظہار اطمینان کیا ہے، ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے، عدی نے ثقہ اور مستملی نے مستقیم الحدیث کہا ہے، ابن حبان نے کہا ہے وہ غرائب کی روایت کرتے ہیں،

بغداد سے دمشق گئے اور وہاں کے قاضی بنائے گئے، یحییٰ بن اکثم کی معزولی کے بعد جب جعفر بن عبدالواحد عہدۂ قضاء پر مامور ہوئے تو انھوں نے محمد بن اسمٰعیل بن علیہ

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۵۷ و تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۸

کو دمشق کا قاضی مقرر کیا، وہ ۲۶۴ھ تک اسی عہدہ پر رہے،[۱]

ربعی بن ابراہیم بن مقسم | ابراہیم بن مقسم کی دوسری اولاد عُلیّہ کے بطن سے ربعی تھے، جو اسمٰعیل بن ابراہیم کے بعد پیدا ہوئے، صاحبِ طبقات ابن سعد نے اس کی تصریح کی ہے،[۲]

ابن ابی حاتم نے کتاب الجرح والتعدیل میں لکھا ہے کہ ربعی بن ابراہیم بن مقسم، اسمٰعیل بن علیہ کے بھائی ہیں، انھوں نے یونس اور عبدالرحمٰن بن اسحاق سے روایت کی ہے، اور ان سے ابوخیثمہ اور حماد بن زاذان نے روایت کی ہے، ان کی علمی جلالت شان کے لیے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ قول کافی ہے:

کنا نعد ربعی ابن عُلیّۃ	اسماعیل بن علیہ کے بھائی ربعی بن
اخا اسماعیل بن علیۃ	علیہ کو ہم لوگ اپنے اسلاف و شیوخ
من بقایا شیوخنا	کی یادگار شمار کرتے تھے،

اور یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ ربعی بن علیہ ثقہ اور مامون ہیں،[۳]

---

۱ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۵ و ۵۶ ۲ طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۳۲۵ ۳ کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ قسم ۱ ص ۵۱۰

تذکرۃ المحدثین (حصۂ دوم)

تذکرۃ المحدثین کا پہلا حصہ ائمۂ صحاح کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور صاحب تصنیف محدثین کے حالات و سوانح اور فن حدیث سے متعلق ان کی شاندار خدمات پر مشتمل تھا، یہ دوسرا حصہ چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور صاحبِ تصنیف محدثین عظام کے حالات اور حدیثی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہے،

مولفہ:- ضیاء الدین اصلاحی قیمت:- ۱۶ روپیے "منیجر"

حضرت سالار مسعود غازیؒ کے سوانحی ماخذ

از

جناب معین احمد صاحب علوی بہرائچ

حضرت سالار مسعود غازیؒ کا نام نامی شمالی ہندوستان میں کافی مشہور ہے، دہلی سے لیکر بنارس، غازیپور، جونپور، مرزاپور کے علاقہ تک ان کی یادگاریں ملتی ہیں، جن میں سے کئی مقامات پر ہندی مہینے چیت کے حساب سے میلہ ہوتا ہے، ہندوستانی عوام کو ان سے بڑی عقیدت ہے، ان کا مزار مشہور تاریخی شہر بہرائچ میں واقع ہے، جو شمالی مشرقی ریلوے کی گونڈہ نیپال گنج شاخ کا مشہور اسٹیشن اور ضلع کا صدر مقام ہے، گونڈہ سے ۳۵ میل ۴۳ کیلومیٹر دور واقع ہے، مزار اسٹیشن سے شمال جانب بھنگا روڈ پر اسٹیشن سے تقریباً ایک میل دور واقع ہے،

حضرت سالار مسعود غازیؒ کی ذات گرامی کئی ناموں سے مشہور ہے، کسی علاقہ میں بالے میاں اور بالا پیر، کہیں غازی میاں اور غازی بابا، اور کہیں سید سالار اور سالار زحب کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، اصلی نام امیر مسعود ہے، ان کی مفصل سوانح حیات پر روشنی محمود غزنوی اور اس کے بعد کے زمانہ کی تاریخوں کی روایتوں سے بھی پڑتی ہے، لیکن تاریخوں میں ان کا براہ راست تذکرہ آٹھویں صدی کی لکھی ہوئی تاریخوں سے شروع ہوتا ہے،

سفرنامہ ابن بطوطہ (۷۴۳ھ) تاریخ فیروز شاہی برنی (۷۵۸ھ) شمس سراج عفیف (۷۹۵ھ)

واقعات مشتاقی (سنہ) میں ان کا اور ان کے مزار کا ذکر موجود ہے، پھر اکبری عہد کی

تاریخوں میں سے طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، اکبرنامہ اور منتخب التواریخ میں ذکر آیا ہے،

یہانتک کہ صاحبِ مرأۃ الاسرار شیخ عبدالرحمٰن چشتی کی مستقل کتاب مرأۃ مسعودی سامنے

آتی ہے، جو جہانگیر کے زمانہ میں تصنیف پائی ہے، مصنف کا بیان ہے کہ مرأۃ مسعودی کا

ماخذ ملا محمد غزنوی کی تاریخ ہے، جو محمود غزنوی کے ساتھ آئے تھے؛ اس لحاظ سے مرأۃ

مسعودی کا پایہ فیروز شاہ سے اکبر کے دور تک کی تاریخوں سے بڑھ جاتا ہے،

حضرت سالار مسعود غازی کا جو نسب نامہ مرأۃ مسعودی میں ہے، اس سے وہ نسباً

علوی قرار پاتے ہیں، تاریخ فیروز شاہی وغیرہ میں ان کے نام کے ساتھ سید نہیں لکھا گیا ہے،

مولانا عبدالرحمٰن چشتی نے انھیں سید الشہداء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ نسلاً علوی تھے،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسم گرامی ان کے صاحبزادہ حضرت محمد بن حنفیہ کے ذریعہ بارہویں

پشت میں ہے، ان کے علوی ہونے کے باوجود ان کا محمود غزنوی کے رشتہ داروں میں

ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس زمانہ میں ایسی رشتہ داریاں ہوتی تھیں،

ابوالفضل نے ان کو "خویشاوند سلطان محمود غزنوی" لکھا ہے، اور فرشتہ نے

"اقارب سلطان محمود غزنوی بودہ" تحریر کیا ہے، ان کا ننہالی تعلق محمود غزنوی کے خاندان

سے ہے، ان کی ماں بی بی ستر معلی محمود کی سگی بہن بلکہ رشتہ کی بہن تھیں،

حضرت سالار مسعود غازیؒ کے والد ماجد سالار ساہو ۴۰۵ھ میں ایک سرکاری

تقریب پر قندھار اور بھٹنڈ کی راہ سے اجمیر پہنچے اور سالار مسعود غازی کی پیدائش یہیں

اجمیر میں ۲۱ رجب ۴۰۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۰۱۵ء کو ہوئی، خزینۃ الاصفیا میں "مطلعِ نور"

تاریخ پیدائش درج ہے،

مرأۃ مسعودی میں ہے کہ

"جب چار سال چار ماہ چار دن کے ہوئے تو تعلیم کے لیے حضرت سید ابراہیم ہا...

بزرگ کے سپرد کیے گئے، نو برس کی عمر میں علم صوری و معنوی سے مالامال ہوئے،

دس سال کی عمر میں عبادت الٰہی کا شوق ہوا، شب بیدار رہتے، پہر دن چڑھے

نماز چاشت و تلاوت قرآن پاک سے فرصت ہوتی، دیوان عام میں درویشان

اہل باطن کے ساتھ صحبت رکھتے، تقریر دلچسپ فرماتے، ہمیشہ باوضو رہتے،

غربا و مسکین لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے، عمدہ لباس اور خوشبو کا

شوق تھا، تیراندازی میں کمال حاصل تھا، آپ کے غزوات مشہور ہیں"

یہ تعلیمی زمانہ اجمیر ہی میں گذرا، آپ کے والد سالار ساہو محمود غزنوی کے حکم سے

[۱۵ رجب] ۴۱۴ھ میں اجمیر سے کاہلیر کی مہم پر گئے اور مختلف مہمیں انجام دیتے رہے، اس کے بعد جب

محمود غزنوی سومنات کے مندر کی مشہور مہم پر ہندوستان آیا تو سالار ساہو نے اپنے

نو عمر لڑکے کو ساتھ لیکر اس میں شرکت کی، اس کے بعد سلطان اپنے بھانجے سالار مسعود

کو اپنے ساتھ غزنی لے گیا، لیکن پایہ تخت غزنی کی سیاست سالار مسعود کے لیے سازگار

نہ تھی، محمود غزنوی خود تو ان سے محبت کرتا تھا لیکن اس کا بیٹا مسعود غزنوی اور وزیر

احمد بن حسن میمندی اس محبت سے خوش نہ تھے، اس کا قدرتی اثر حضرت سالار مسعود غازی

پر بھی پڑا، محمود کی زندگی کا یہ آخری دور تھا، اور مسعود غزنوی کے اقبال کا آفتاب طلوع

ہونے والا تھا، مسعودی جماعت ہر جگہ چھائی ہوئی تھی، اس لیے سالار مسعود غازی نے پایہ تخت

میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا، اس لیے محمود سے اجازت لیکر گیارہ ہزار مجاہدین کیسا تھ

غزنی سے ہندوستان کی طرف چل پڑے، مختلف مقامات شیخو پور، ملتان، اوچھ، اجودھن، دہلی، میرٹھ، گڑھ مکتشر، سنبھل، گنور، ڈیبائی، دونده گڑھ، بدایوں، قنوج، گوپا مئو، کالور، مہوبا، بلگرام، ملانواں، ستر کھ، کڑا، مانک پور اور ردالمئو پہنچے، ان مقامات میں بعض جگہ راجاؤں نے مقابلہ کیا لیکن فتحیابی کا سہرا سالار مسعود ہی کے سر رہا، محمود غزنوی کے حملوں کے بعد جو مسلمانوں کی بستیاں پہلے ہی سے جگہ جگہ قائم ہو چکی تھیں ان کو سید سالار کی فتوحات سے تقویت پہنچی، نئی آبادی کا اضافہ ہوا، غرضیکہ فتوحات نے آگے بڑھنے کے عزم کو قائم رکھا اور امیر مسعود اس طرح ستر کھ ضلع بارہ بنکی تک آگئے، اسی مقام پر سالار ساہو سلطان محمود غزنوی کے انتقال، بیوی کی وفات اور اپنی ضعیفی کی وجہ سے دنیا سے دل برداشتہ ہو کر اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے، اور بیٹے سے آکر ملے، اور یہیں ان کی وفات ہوئی، اور یہیں مدفون ہوئے، سید سالار اپنے والد کی زندگی ہی میں بہرائچ کی طرف متوجہ ہوئے، مراۃ مسعودی کے مطابق پہلے سالار سیف الدین کو اس کی مہم پر بھیجا، سالار سیف الدین نے کچھ دنوں کے بعد کمک طلب کی، سید سالار بذاتِ خود مدد کے لیے روانہ ہو گئے، .... اس عرصہ میں قرب و جوار کے تمام راجا یہاں جمع ہو گئے، اور سر جوڑ کر انکے مقابلہ کی تیاریاں کیں، چنانچہ سید سالار سے انکی تین لڑائیاں ہوئیں پہلی دو لڑائیوں میں سید سالار نے کامیابی حاصل کی، مگر ان کے رفقا کی بڑی تعداد جنگ میں کام آگئی، تیسری جنگ ۱۳ رجب ۴۲۴ھ کو شروع ہوئی، راجاؤں کی فوجیں بڑی تعداد میں تھیں، اور انھیں کمک بھی ملتی جاتی تھی، دونوں فوجوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا، سید سالار کے ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہوتے گئے، آخر ۱۴ رجب ۴۲۴ھ مطابق ۱۰ جولائی ۱۰۳۳ء کو سالار غازی نے بھی جامِ شہادت نوش کیا، جہاں شہید ہوئے وہیں

مزار مبارک ہے، انوار و برکات کا فیض جاری ہے، مزار مبارک پر ذیل کا قطعۂ تاریخ سنگی قلعہ کے دروازہ پر نصب ہے:

محبوب خدا ابو د امیر مسعود — در چار صد و پنج در آمد بہ وجود

تا مدت بست در جہاد افزود — در چار صد بست و چار رحلت فرمود

اس قطعہ کو مسٹر بیلی نے ابوالفضل کے حوالہ سے نقل کیا، اس سے اس کی قدامت کا پتہ چلتا ہے، (المحمود - پروفیسر حبیب علی گڑھ)

شہادت کے بعد ہی سے فیض و تصرف کے واقعات کا تذکرہ ملتا ہے، غزانامہ مسعودی از مولوی عنایت حسین مطبوعہ ۱۸۷۸ء میں موضع نگرور ضلع بہرائچ کی بانجھ عورت کے یہاں ولادت کا قصہ موجود ہے، شہادت کے تیس برس بعد زہرہ بی بی شیخ رکن الدین کی مادر زاد نابینا صاحبزادی کی آنکھ میں روشنی آجانے کا مشہور واقعہ سامنے آتا ہے، مرأۃ الاسرار کے مصنف نے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے زہرہ بی بی عقیدت میں ردولی سے آکر مزار مبارک پر جاروب کشی کے لیے مقیم ہوئیں، اپنے خلوص و عقیدت میں مقبرہ کی تعمیر کی، خزینۃ الاصفیا نے اخبار الاخیار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک بار کچھ حصہ کھودا گیا تو بڑے انوار و برکات کا ظہور ہوا، اخبار الاخیار مولانا عبدالحق محدث دہلوی ایسے معتبر مصنف کی تصنیف ہے جو اکبری دور میں لکھی گئی ہے،

انوار و برکات کی تصدیق ۱۸۷۵ء کی مطبوعہ ایک کتاب "ترنم خداداد در ذکر مسعود" نامی کتاب سے بھی ہوتی ہے، درگاہ شریف سرکاری انتظام میں آچکی تھی، مرزا خداداد بیگ اسسٹنٹ کمشنر اوقاف اس کتاب کے مصنف ہیں، مرزا صاحب کا خاندانی تعلق سر سید احمد خاں سے تھا، ان ہی کے لڑکے سید محمود کے ساتھ ولایت میں تعلیم حاصل کی تھی،

اس کتاب میں بھی ایک واقعہ اس طرح درج ہے،

"قدیم الایام سے مقبرہ شریف میں ایک دروازہ نہایت تنگ اور پست جانب جنوب تھا، میلہ کے ایام میں، ہجوم وانبوہ زائرین کے باعث آمد ورفت میں بڑی دقت واقع ہوتی تھی، اور گنبد کے اندر بسبب تنگی صحن تاریکی، چقلش، کشمکش اور حبس رہتا تھا، چنانچہ ایک سال بیس بائیس آدمی گھٹ کر مر گئے، انجمن وقف نے گنبد میں جانب شمال ایک مختصر دریچہ کھولا اور ایک پنکھا لگا کر ہوا کا انتظام کیا، ..... دریچہ کھولنے میں جو گنبد سے خشتہائے پختہ (پکی اینٹیں) برآمد ہوئیں، ان پر لفظ اللہ کندہ تھا، اور ان میں سے گلاب وکیوڑہ کی خوشبو آتی تھی، سبحان اللہ۔"

اس واقعہ سے ایک تو مجمع کی وجہ سے ابن بطوطہ اور محمد شاہ تغلق کی حاضری کے وقت اندر نہ جا سکنے، دوسرے زہرہ بی بی کی عقیدت کی سچی گواہی پر روشنی پڑتی ہے،

اسی طرح ۱۸۷۵ء میں مصنف آئینۂ اودھ مولوی ابوالحسن صاحب مانک پوری نے درگاہ شریف جا کر تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ مزار شریف خاص دودھ اور راکھ سے بنایا گیا ہے (آئینۂ اودھ ص ۱۳۳)

چیت کے مہینے میں زبردست میلہ ہوتا ہے، لاکھوں کا مجمع باہر سے آتا ہے، جس میں اکثریت اہل ہنود کی ہوتی ہے، عجیب ذوق وشوق میں حاضر ہوتے ہیں، قومی یکجہتی کی زندہ مثال تقریباً آٹھ سو سال سے قائم ہے،

تاریخی کتابوں کے جائزے کے مطابق سفرنامۂ ابن بطوطہ سے پہلے کی کسی کتاب میں ان کا نام نہیں آتا، نہ کسی مہم کا پتہ چلتا ہے، سلطان محمود غزنوی کے دور کی سب سے پہلی کتاب تاریخ یمینی ہے، جس کو محمودی دربار کے مورخ ابو نصر محمد بن عبدالجبار العتبی نے

لکھا ہے، جو محمود غزنوی کا سکریٹری تھا، اس کتاب میں ۴۱۱ھ مطابق ۱۰۲۰ء تک کے حالات ہیں، یعنی جس وقت سالار مسعود غازی سات سال کے تھے، اس میں ان کا کوئی حال نہیں ہے، بعض ضمنی باتوں پر روشنی پڑتی ہے، یہ تاریخ ایشیا اور یورپ دونوں جگہ قدر اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اس کی راست نگاری اور اعتدال پسندی قابلِ تعریف ہے، ادبی نقطۂ نظر سے اس کی خاص اہمیت ہے، فارسی میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں، اس کے فارسی ترجمہ کا ایک نسخہ رامپور لائبریری میں ہے، پہلا ترجمہ ۵۸۲ھ میں ہوا تھا، دوسرا ترجمہ محمد کرامت علی دہلوی نے کیا جو مختلف کتب خانوں میں ملتا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ جیمس رینالڈ نے ۱۸۵۸ء میں شائع کیا تھا، اس کے اقتباسات کے ترجمے مولف ڈاؤسن نے تاریخ ہند جلد دوم میں شائع کیے ہیں، اصل کتاب نایاب ہے،

(۲) اس تاریخ کے بعد ابو سعید عبد الحئی بن ضحاک بن محمود گردیزی کی کتاب زین الاخبار کا نمبر آتا ہے، جو ۴۴۲ھ مطابق ۱۰۵۰ء میں محمود غزنوی کے انتقال کے نو، دس سال بعد لکھی گئی ہے، اس کو بڑی محنت سے ڈاکٹر محمد ناظم نے برلن میں طبع کرا کے علمی دنیا پر بڑا احسان کیا ہے، سید سالار موصوف کے سلسلہ میں العتبی کی طرح یہ کتاب بھی خاموش ہے، محمود غزنوی کے ہندوستانی حملوں کا تذکرہ ہے، کشمیر پر محمود کے حملہ کا ذکر ہے، لیکن سالار موصوف یا ان کے والد سالار ساہو کا تذکرہ نہیں ہے،

(۳) اس کے بعد ابو الفضل محمد بن حسن البیہقی کی تاریخ کا نمبر آتا ہے، جو ۴۵۱ھ مطابق ۱۰۵۹ء میں زین الاخبار کے کچھ ہی دن بعد لکھی گئی، اس میں ۴۵۱ھ تک کے حالات ہیں، بیہقی محمود غزنوی کے دفتر میں ملازم تھا، محمود کے بیٹے مسعود غزنوی کے زمانہ میں اس نے بڑا عروج پایا، اس کی کتاب میں بھی سید سالار موصوف کا ذکر نہیں ہے، اس کی

کتاب کی بارہ جلدوں میں چار پانچ جلدیں پائی جاتی ہیں، محمود غزنوی کے متعلق تاریخ کا جو حصہ تھا، وہ دنیا سے اٹھ گیا، جو باقی ہے اس میں محمود کے بیٹے مسعود کا حال ہے، ان جلدوں کو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شائع کیا ہے، اس میں ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء یعنی مسعود غزنوی کی تخت نشینی سے حالات کا آغاز ہوتا ہے، ضمنی طور پر بہ نسبت العتبی اور گردیزی کے اس مورخ سے زیادہ مدد ملتی ہے،

(۴) ابوریحان البیرونی۔ اسی زمانہ یعنی محمود غزنوی کے انتقال کے سال بھر بعد ۱۰۳۱ء میں البیرونی ہندوستان آیا ہے، یہاں کئی سال رہ کر پچاس سال کی عمر میں سنسکرت ایسی مشکل زبان سیکھی اور قابلیت کے ساتھ سنسکرت کی کتابوں کے عربی ترجمے کیے، ہندوستان میں کئی سال رہ کر یہاں کے رسم و رواج دیکھ کر اپنی مشہور کتاب تحقیق ماللہند شائع کی، علم الہندیات پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے، اسکا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، اردو میں بھی دو جلدوں میں ہے، اس کتاب میں صرف ہندوستانی رسم و رواج اور علوم کا تذکرہ کیا ہے، جغرافیائی حالات بیان کئے ہیں، تاریخی حالات نہ ہونے کے برابر ہیں، یہ کتاب ۱۰۳۵ء سے قبل لکھی گئی ہے، اس لئے سلطان محمود کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے، ہمارے مضمون سے متعلق اس کتاب میں کوئی چیز نہیں ملی،

دوسری ہم عصر کتابوں تک ہماری رسائی نہ ہو سکی، ڈاکٹر محمد ناظم نے اپنی انگریزی کتاب Life and Times of Mahmud of Ghazna میں ص ۳۰۲ پر چند کتابوں کے نام دیے ہیں، ڈاکٹر ناظم علی گڑھ میں تعلیم پانے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے محمود غزنوی پر ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی، ان کی کتاب پر سر ٹامس آرنلڈ نے دیباچہ لکھا ہے، ڈاکٹر جادو ناتھ سرکار مشہور ہندوستانی مورخ نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے،

ڈاکٹر ناظم محکمہ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ اور قائم مقام ڈائرکٹر ہو کر پنشن یاب ہوئے، ۱۹۵۵ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا، ان کی کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے، جو کمیاب ہے،

(۵) دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:-

محمود غزنوی کی سرکاری یادداشت یا واقعات جس کا نام دولت نامہ ہے،

تاج الفتوح۔ محمودی دربار کے مشہور شاعر عنصری کا قصیدہ ہے جس میں محمود کی لڑائیاں اور فتوحات نظم کی ہیں، عنصری کا پورا نام حسن بن احمد تھا، کنیت ابوالقاسم، عنصری تخلص، یہ قصیدہ تقریباً ۲۰۰ شعروں کا ہے، جس میں محمود کے تمام معرکے اجمالاً لکھے ہیں،

مقامات ابونصر مشکانی۔ محمودی دربار کے دبیر ابونصر مشکانی کی کتاب ہے،

زینت الکتاب۔ تاریخ محمود وراق جو ۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء میں تصنیف ہوئی جس میں ۴۰۹ھ / ۱۰۱۸ء تک کے حالات ہیں،

تجارب الامم۔ مصنفہ بلال بن محسن بن ابراہیم الصابی۔

فرید التواریخ۔ مصنفہ ابوالحسن محمد بن سلیمان

ان سب کتابوں کا تذکرہ عباس خاں شروانی سابق صدر درگاہ شریف بہرائچ نے اپنی مایہ ناز کتاب حیات مسعودی میں کیا ہے، یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی، سید سالار غازی کے حالات میں نہایت مفصل، جامع اور بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے، افسوس اب نایاب ہے،

(۶) ان سب کتابوں کے علاوہ ملا محمد غزنوی کی تواریخ کہنہ بہت اہم ہے جو اب نہیں ملتی، مولانا عبدالرحمن چشتی مصنف مراۃ مسعودی نے اپنی کتاب مراۃ مسعودی کو اس کا خلاصہ بتایا ہے، ملا محمد غزنوی کے متعلق مراۃ مسعودی میں ذیل کی تصریح ہے کہ

ملائے مذکور خلفا و مقربان سلطان	ملا محمد غزنوی سلطان محمود کے
محمود بود. فاما آخر عمر بخدمت سالار	ہم نشین اور معتمد تھے، آخر عمر میں
ساہو و سالار مسعود بسر بردہ بود.	سالار ساہو اور سالار مسعود کے ساتھ
بعد از شہادت سالار مسعود برحمت	زندگی گذاری، سالار مسعود کی شہادت
حق پیوست	کے بعد وفات پائی۔

ان کی تصنیف تواریخ کہنہ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

میں نے تواریخ کہنہ اول سے آخر تک پڑھی ہے، مجھے مسرت حاصل ہوئی اور جو شبہات کہ میرے دل میں تھے جاتے رہے، کتاب بہت ضخیم تھی، اس میں سلطان محمود اور سالار ساہو کی لڑائیوں کے حالات تھے، جا بجا سالار مسعود کا بھی ذکر تھا، کتاب واقعہ شہادت سالار مسعود پر ختم ہوئی، بعض لوگوں نے جو سید سالار مسعود سے عقیدت رکھتے تھے مجھ سے اصرار کیا کہ ہم کو سلطان محمود کے قصوں سے مطلب نہیں۔ اچھا ہے کہ آپ سالار مسعود غازی کے حالات کو الگ کر کے علیحدہ حالات لکھ دیجئے، اور میری بھی یہی آرزو تھی، میں بغیر باطنی اشارہ اور اس فیض خاص کے جو مجھ پر ہے کچھ نہیں لکھنا چاہتا تھا، آخر اس کتاب کے جمع کرنے میں میں نے سید سلطان الشہدا کی روح سے استخارہ کیا، آخر رات میں میں نے معاملہ میں دیکھا کہ اپنی مہربانی خاص اور اپنی زبان خاص سے اجازت عنایت فرمائی، اس کے بعد فقیر نے عرض کی کہ میں کتاب شروع کرتا ہوں لیکن اس کی مشکلات اور اچھے برے یا کم و زیادہ واقعات میں میری رہنمائی فرمائی جائے، سید سالار مسعود نے ارشاد فرمایا کہ ضرور خبر رکھوں گا اور تم کو آگاہ کرتا رہوں گا۔"

چنانچہ میں نے بیان واقعی کو جمع کر کے مرأۃ مسعودی نام رکھا، اللہ تعالیٰ اس کے

پڑھنے والے کو مسعود اور نیک بنا دے، اس فقیر کی دعا ہے

بحق کاشفِ اسرار مرداں الٰہی عاقبت محمود گرداں

الغرض میں نے سید سلطان الشہدا کے حالات قلم بند کر کے پانچ داستانوں میں تقسیم کیے ہیں اور سلطان الشہدا کے حالات، خوارقِ عادات بعض معتبر کتابوں اور اہل باطن بزرگوں سے خود سن کر شامل کر دیے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے سہو اور خطا سے بچائے۔

ملا محمد غزنوی کے حالات ابھی تک کہیں تفصیل سے نہیں مل سکے اور نہ ان کی کتاب کا پتہ ہے، سید سالار صاحب کے زمانہ کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے اہم (۱) راج ترنگنی (تاریخ کشمیر) ہے، جس کو کلہن پنڈت نے ۵۴۵ھ / ۱۱۱۵ء میں تصنیف کیا، یہ سنسکرت زبان کا مشہور رزمیہ (Epic) ہے، اکبر بادشاہ نے اس کا فارسی ترجمہ کرایا تھا، اب انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، کپتان انتھونی ٹرائر (Capt. Anthony Troyer) کا فارسی ترجمہ اچھا سمجھا جاتا ہے، مکمل راج ترنگنی کے نام سے ٹھاکر اچھر چند نے اردو میں بھی شگفتہ انداز میں ترجمہ کیا ہے، جو ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا، اس میں محمود کے حملوں کا کچھ حال ہے، علمی اعتبار سے یہ کتاب ہندوستانی ادب کا شاہ کار سمجھی جاتی ہے،

(۲) تاریخ کامل ابن اثیر۔ ۶۲۹ھ میں ابن الحسن علی المعروف بہ ابن الاثیر نے تصنیف کی،

(۳) تاج المآثر۔ اس عہد کی مشہور و معروف تاریخ ہے، جو قطب الدین ایبک کی خواہش پر لکھی گئی ہے، اس کا مولف حسن نظامی نیشاپوری تھا، جس نے ۶۰۲ھ میں کتاب لکھنی شروع کی، اس میں ۵۸۷ھ سے ۶۱۲ھ تک کے حالات ہیں، اس کی زبان بہت مقفیٰ اور مسجع ہے، اسی وجہ سے مقبول عام نہ ہو سکی، اس کی زیادہ سے زیادہ سطروں میں

کم سے کم معلومات فراہم ہوتے ہیں۔ (بزم مملوکیہ ص ۱۴۲)

(۳) طبقات ناصری۔ اس کے مولف مولانا ابو عمر قاضی منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی ہیں، جو اپنے عہد کے جید عالم، صاحب دل صوفی اور ممتاز شاعر بھی تھے ۶۵۸ھ میں ستر سال کی عمر میں سلطان ناصر الدین محمود کی وفات سے پہلے ہی یہ کتاب ختم کی، یہ ہر زمانہ میں ایک اہم اور کارآمد تاریخ سمجھی گئی ہے، اس میں ۲۳ طبقات ہیں جس میں آفرینش عالم سے ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۶۰ء تک کے تاریخی حالات درج ہیں، اس کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے، اور پڑھنے والوں پر اثر کرتی ہے، اس کتاب کے ماخذوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی تلاش و جستجو سے لکھے گئے ہیں، ہر دور کے مورخ اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں، سب سے پہلے اس کتاب کو ۱۸۶۴ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا،

اس کتاب میں بھی ہمارے مضمون سے متعلق ضمنی حالات پر روشنی پڑتی ہے، اس کتاب میں اس قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ بعض جگہ ضروری واقعات رہ گئے ہیں (بزم مملوکیہ ص ۱۹۰)

(۴) سفرنامہ ابن بطوطہ (متوفی ۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷ء) آٹھویں صدی کا مشہور سیاح ہے، سلطان محمد تغلق کے وقت میں ہندوستان آیا، یہاں کے چپہ چپہ کو دیکھا، اس مصنف کے مشاہدات چونکہ عینی ہیں، اس لیے زیادہ معتبر اور مستند ہیں، محمد شاہ تغلق جب بہرائچ سالار مسعود غازیؒ کے مزار پر حاضر ہوا تو ابن بطوطہ اس کے ساتھ تھا، اس نے اس حاضری کی تفصیل لکھی ہے، یہی وہ پہلی کتاب ہے جس میں سید سالار مسعود غازی کا نام پہلے پہل آتا ہے، اس کتاب کا ترجمہ عجائب الاسفار کے نام سے مولوی محمد حسین دہلوی نے کیا ہے،

تاریخ فیروز شاہی۔ از شمس سراج عفیف، اس میں فیروز شاہ تغلق کے حالات ہیں، اس کتاب کا اردو ترجمہ مولوی فدا علی طالب نے کیا ہے جو دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

حیدر آباد سے شائع ہوئی، اس میں سید سالار مسعود کے مزار پر فیروز شاہ بادشاہ کی آمد کا ذکر اس طرح ہے:

مختصر یہ کہ بادشاہ (فیروز شاہ) نے ۷۷۶ھ میں بہرائچ کا سفر کیا اور شہر میں پہنچکر بندگی سید سالار مسعود کے آستانہ پر حاضر ہو کر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کی، بادشاہ نے بہرائچ میں چند روز قیام کیا اور اتفاق سے ایک شب حضرت سید سالار کی زیارت خواب میں نصیب ہوئی سید سالار نے فیروز شاہ کو دیکھکر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا یعنی اس امر کا اشارہ کیا کہ اب پیری کا زمانہ آگیا، بہتر ہے کہ اب آخرت کا سامان کیا جائے اور اپنی ہستی کو یاد رکھا جائے صبح کو بادشاہ نے حلق کیا اور بادشاہ کی اتباع میں اسی روز خانان اور ملوک نے سر منڈایا (حصہ پنجم۔ شاہزادہ فتح خاں کی رحلت۔ بادشاہ کی محلوقی)

روضۃ الصفا۔ اس کتاب کا پورا نام "روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء" ہے، اس کا مصنف محمد بن خاوند شاہ بن محمود ہے، زیادہ تر میر خاوند یا خوند کے نام سے مشہور ہے، ۹۰۳ھ میں وفات پائی، میر علی شیر (وزیر سلطان حسین شاہ ایران) اس کا سرپرست تھا، اسی زمانہ میں یہ تاریخ مرتب ہوئی، صاحب مرآۃ مسعودی نے اسی کتاب کے حوالے دیے ہیں، سر ہنری ایلیٹ نے مقابلہ کر کے دیکھا ہے، خاکسار راقم الحروف نے بھی مقابلہ کر کے دیکھا ہے، جہاں جہاں حوالہ دیا ہے پوری عبارت ملتی ہے، روضۃ الصفا ۱۸۹۱ء میں تیسری بار نولکشور پریس نے چھاپی تھی، اس کے بعد عہد اکبری کی تاریخوں کا نمبر آتا ہے جن میں واقعات مشتاقی، طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، اکبرنامہ، منتخب التواریخ، اخبار الاخیار قابل ذکر ہیں،

واقعات مشتاقی۔ اس کا مولف شیخ رزق اللہ مشتاقی بن شیخ سعد اللہ

ابن شیخ فیروز ترک بخاری ہے، یہ شیخ فیروز وہی ہیں جن کا مزار بہرائچ کی عیدگاہ کے شمال میں دریائے سرجو کے کنارے پُر فضا مقام پر زیارت گاہ خلق ہے، اور فیروز شہید کے نام سے مشہور ہیں یہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا خاندان ہے، شیخ فیروز شرقی بادشاہوں اور لودی بادشاہوں کی جنگ میں بہرائچ میں شہید ہوئے تھے (تتمہ اخبار الاخیار) شیخ رزق اللہ مشتاقی ۸۹۷ھ (۱۴۹۵ء) میں پیدا ہوئے اور ۹۸۹ھ میں وفات پائی، یہ بڑے سیاح تھے، فارسی میں مشتاقی اور ہندی میں راجن تخلص کرتے، واقعات مشتاقی میں سلطان بہلول لودی سے عہد اکبری تک سلسلہ وار حالات ہیں، شیر شاہ، اسلام شاہ، محمود شاہ، محمود علی، غیاث الدین خلجی (مالوہ) اور مظفر شاہ (گجرات) کے حالات ہیں، اس کتاب میں سید سالار مسعود کے نام پر جو نشان (جھنڈے) کا جلوس نکلتا تھا اس پر پابندی عائد کرنے اور مجاورین کی بناکردہ جھوٹی قبروں کو کھدوانے کا تذکرہ ہے۔

طبقات اکبری۔ مولانا خواجہ نظام الدین احمد بخشی، جو اکبری دور کے ممتاز مورخ ہیں، ہندوستان کی تاریخوں میں ان کی تاریخ اہم سمجھی جاتی ہے، یہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں مکمل ہوئی۔ اس کی پہلی جلد میں سبکتگین سے لیکر سلطان ابراہیم لودی تک کے حالات ہیں دوسری جلد میں بابر سے اکبر کے ۳۸ ویں سال تک، تیسری جلد میں دکن، گجرات، بنگالہ، جونپور، مالوہ، کشمیر، سندھ اور ملتان کے بادشاہوں کا ذکر ہے۔

تاریخ فرشتہ۔ مولفہ ملا احمد ٹھٹھوی، ۱۰۱۵ھ مطابق ۱۶۰۶ء میں تصنیف ہوئی، نولکشور پریس نے اس کا ترجمہ کئی بار شائع کیا، ایک ترجمہ تحفۃ الملوک کے نام سے مولوی سید حیدر علی نے پہلے اور دوسرے مقالہ کا طبع کرا کے شائع کیا،

اکبرنامہ۔ مولفہ علامی ابوالفضل۔ ابوالفضل کی محنت وکاوش اور انشا کا شاہکار ہے،

پہلی جلد میں بابر و ہمایوں کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اکبری حکومت کے مفصل واقعات ہیں، آئین اکبری کو اس کی تیسری جلد سمجھنا چاہئے،

منتخب التواریخ۔ مولفہ ملا عبدالقادر بدایونی، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے میں اکبر کے قبل سلاطین ہند کی تاریخ ہے، دوسرے میں اکبری عہد کے سارے واقعات ہیں، تیسرے میں اس عہد کے علما، مشائخ اور اطبا، و شعرا کا ذکر ہے، ۱۰۰۴ھ مطابق ۱۵۹۵ء میں یہ کتاب ختم کی گئی ہے، اس کا انگریزی ترجمہ بھی جارج ربنکنگ اور دوسرے انگریزوں نے کیا ہے، جو کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے،

ان سب کتابوں میں سید سالار مسعود غازیؒ کے سلسلے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں، طوالت مضمون کی وجہ سے تفصیل سے معذوری ہے،

عہد اکبری کے بعد شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں صاحب مرأۃ الاسرار شیخ عبدالرحمٰن چشتی کی مستقل کتاب مرأۃ مسعودی سامنے آتی ہے، جس میں تاریخ فیروز شاہی، اجاریہ منی کی تاریخ، مولانا محمد غزنوی کی تواریخ کہنہ کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے، مرأۃ مسعودی حضرت سالار مسعود کی شہادت کے چھ سو سال بعد لکھی گئی ہے، مولانا عبدالرحمٰن چشتی صوفی بزرگ تھے، علاقہ بارہ بنکی کے رہنے والے تھے، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سے خاص عقیدت تھی، وہیں چلہ کشی کر کے سکون حاصل کرتے، اجمیر شریف سے بشارت ملی کہ بہرائچ جاؤ، یہاں حاضر ہوئے، چلہ کشی کی اور فیض باطنی سے مالا مال ہوئے، اسی قیام کے دوران مرأۃ مسعودی تصنیف کی، جس کی تفصیل مرأۃ الاسرار و مرأۃ مسعودی میں موجود ہے، مولانا نے اپنا تفصیلی حال مرأۃ الاسرار میں مولانا عود کے حالات میں لکھا ہے، جس سے ان کے مجاہدات، ذوق کتب بینی اور عقیدت مندی کا پتہ چلتا ہے، مولانا ایک صاحب ذوق، عبادت گذار

صوفی بزرگ تھے، ساری عمر سیاحت اور مجاہدات میں گذاری، آخر میں نعمت عشق سے مالامال ہوئے، ان سب نعمتوں کے حاصل ہونے کے بعد مراۃ مسعودی لکھتے وقت سید سالار کی روح سے استفادہ کرنے کی کوشش کی،

مرأۃ مسعودی پر اکثر لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، انگریز مصنفوں نے بھی کافی بحث کی ہے، سر ہنری ایلیٹ ایسے قابل محقق نے لکھا ہے کہ "یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مرأۃ مسعودی جھوٹی ہے...... مراۃ مسعودی کے حالات ماخوذ ہیں، من گھڑت نہیں۔

مولانا عبدالرحمن چشتی کا بہت بڑا احسان ہے جو انھوں نے مرأۃ مسعودی لکھ کر کیا ہے، ورنہ شکوک اور اعتراضات کے دروازے بند نہ ہوتے، فیروز شاہ تغلق کے وقت میں بھی منافقین نے بادشاہ کے دل میں شکوک پیدا کیے اور وہ سید سالار غازی کی روحانیت کا منکر رہا، آخر بادشاہ کی صدق دلی اور لگن کام آئی اور عشق الٰہی کا جذبہ کارفرما ہوا، مزار سید سالار مسعود پر حاضر ہوکر فیضیاب ہوا، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔

اس کے علاوہ متعدد مستند صوفیائے کرام نے بھی جن کی بزرگی اظہر من الشمس ہے، اپنے اپنے زمانے میں سالار مسعود غازی کے دربار میں حاضری دیکر نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، اور فیض پایا ہے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ (بہار شریف) حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ (کچھوچھہ شریف) حضرت سید سلطان بہرائچی، سید محمد متوکل کنتوری، شیخ سعد اللہ کیسہ دار کے ملفوظات موجود ہیں۔ پڑھے جاسکتے ہیں، اس صدی کے مشہور بزرگ حاجی شاہ وارث علی صاحبؒ (دیوہ شریف) نے بھی حاضری دی ہے، ایسی حالت میں مولانا عبدالرحمن چشتی کی نذر عقیدت کو کیسے غلط قرار دیا جاسکتا ہے،

اودھ کے مشہور صوفی بزرگ و شاعر شاہ تراب علی قلندرؒ نے کیا

فرمایا ہے:۔

ہے شہیدوں کی گور میں تاثیر
ترے کشتے کی خاک ہے اکسیر

مولانا حسرت موہانی کہتے ہیں:۔

اے عشق تیری فتح بہر حال ہے ثابت
مرکر بھی شہید ان محبت ہوئے غازی

باقیات الصالحات نامی کتاب سے ذیل کے اشعار حیات مسعودی کے مصنف عباس خاں شیروانی نے نقل کیے ہیں، تفنن طبع کے لیے حاضر ہیں:

نہ تاریخ پیشانیاں شد پدید — چناں حالِ مسعود غازی شہید
کہ از حالِ حیدر ز نسلِ شریف — فقیہ مدینہ محمد حنیف
مجاہد فتا و فتا و فتا (جواں شجاع سخی) — قوی پنجہ از نیروے لافتیٰ (مراد حضرت علیؓ)
سنش ایانہ و تولد ثیاب — وفاتش اتابک وگر پیچ و تاب
بشہر رجب بست و یک شد ظہور — چہار و دہ آن گشت زور عنیور
وطن غزنی و مولد اجمیر بود — ز مدفن بہ بہرائچ عزت فزود
خوشا بخت سالار ساہو پدر — کہ سالار مسعود باشد پسر
زہے ام ستر معلی کنار — درو پرورد علوی نامدار

تھے حال محمود غزنی نژاد
کہ رحمت بر و باد ہر بامداد

(حیات مسعودی ص ۱۰۵)

غزل قدسی در نعتِ سرورؐ

از جناب کالیداس گپتا رضا بمبئی

دسمبر ۱۹۷۶ء کے معارف میں ڈاکٹر سمیع الدین احمد لکچرار شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک مضمون بعنوان "نعتِ قدسی اور اس کی مقبولیت" شائع ہوا ہے۔

نعت قدسی (مرحبا سید مکی مدنی العربی) پر متعدد تضمینوں کے دو جداگانہ مجموعے "حدیث قدسی" اور "صحیفۂ قدسی" ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر رہے ہیں، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہیں، کتاب "حدیث قدسی" قاضی محمد عمر نے ۱۲۷۶ھ میں اس مشہور و معروف نظم پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے خمسے جمع کر کے ترتیب دی، ۱۲۷۹ھ میں چھپی، مجموعہ صحیفۂ قدسی حاجی سید شمشیر علی نے ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں ترتیب دینا شروع کیا، جو ۱۳۰۴ھ میں محمود المطابع دہلی میں چھپ کر منظر عام پر آیا، ڈاکٹر صاحب کا مضمون جو ص ۴۴۵ سے ص ۴۶۵ تک پھیلا ہوا ہے، انہی دو مجموعہ ہائے مخمسات پر مبنی ہے، ظاہر ہے میرا مضمون "غزلِ قدسی اور تضمینِ غالب" (مطبوعہ آجکل فروری ۱۹۷۴ء) ان کی نظر سے نہیں گذرا ورنہ شاید انھیں اپنے مضمون کی بیشتر باتیں لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

اسی قسم کی نامکمل واقفیت کی بنا پر سید وزیر الحسن نے بھی فرض کر لیا تھا کہ قاضی محمد عمر والا مجموعہ مخمسات "حدیث قدسی" دراصل دلی کے ایک نعتیہ مشاعرے

کا گلدستہ ہے، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا[۱]، میرا مضمون مطبوعہ آجکل فروری ۱۹۷۴ء اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے شائع کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قاضی محمد عمر صاحب حدیث قدسی کے اولین مرتب نہیں، پہلا مجموعہ محمد حسین خاں تحسین شاگرد ذوق نے (جو اس عہد میں مطبع مصطفائی دہلی کے مالک و مہتمم تھے) اس خیال سے کہ "بعد چھوٹ جانے اس دار فانی کے واسطے بقائے نام اور وسیلۂ نیکی سرانجام کا ہو۔" اس وقت کے نامی گرامی شعرائے ہند سے کچھ ذاتی تعارف کی بنا پر اور کچھ بذریعہ خط و کتابت مخمسات حاصل کر کے ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں مرتب کیا تھا۔

میرے کتب خانے میں تضامین غزل قدسی کے چھ مجموعے ہیں، یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ارتقاء پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے اور ان نسخوں کا مختصر جائزہ لیا جائے، پھر حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

۱۔ "خمسہائے غزلِ قدسی" یا "چمن مدحِ نبیؐ"

مطبع مصطفائی دہلی سے محمد حسین خاں تحسین کے اہتمام سے طبع ہوئی، مطبع کے اندراج کے علاوہ سال تاریخ محمد نظام الدین جوش[۲] کے قطعہ سرورق سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

---

[۱] "دہلی کے اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمینیں" آجکل ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء

[۲] منشی نظام الدین جوش خلف وجیہ الدین پنجابی۔ شگفتہ طبیعت پائی تھی، علی گڑھ میں رہا کرتے تھے ...... خمخانۂ جاوید۔ جلد دوم ص ۳۸۵

جب ہوئی زیب دہ طبع خوشا صلّ علیٰ — فکر تاریخ میں گلشن کی طرف میں جو گیا

بلبل از جوش طرب خواند بشاخ گلہا — وہ چہ گم دید شگفتہ چمن مدحِ نبی

چونکہ کتاب ۱۲۶۹ھ میں مرتب ہو کر ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوئی تھی، اسیلئے اس میں ۱۲۶۹ھ، ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۷۱ھ تینوں سال کے قطعہ ہائے تاریخ ملتے ہیں، خاتمۃ الطبع میں ایک قطعۂ تاریخ جس سے ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتا ہے بہت دلچسپ ہے، یہ مرزا علی صاحب دہلوی نازنین تخلص کا طبع زاد ہے، اور جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے، ریختی میں ہے ؎

نازنین تجھکو اک بتاؤں بات — کہ نگوڑی بڑی ہو بات تیری

سال چھپنے کے اس کتاب کے لکھ — اے بوا اس میں ہے نجات تیری[1]

کتاب کے آخری صفحات میں تحسین کا ایک طویل اور معنی خیز قطعہ "در ذکر شعراء" ہے، جس میں مرتب سمیت ان ایک سو سات شعراء کا ذکر ہے جن کے خمسے زینتِ کتاب ہیں، حالانکہ تحسین استاد ذوق کے شاگرد تھے، تاہم وہ ذوق کو تضمین غزل قدسی پر آمادہ نہیں کر سکے، وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ شاہ ظفر کی تضمین کے ہوتے ہوئے ذوق نے اپنی شمولیت کو بادشاہ کے احترام کے منافی خیال کیا ہوگا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ذوق ہی کی تضمین ہو اور بادشاہ ظفر کے نام سے شائع ہوئی ہو، قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

معنیٔ بیتِ دو عالم شہ ذیجاہ ظفر — لفظ معنیٔ سخاوت شہ با فتح و ظفر

غالب کا ذکر اس طرح آتا ہے ؎

ماہرِ فنِ سخن یعنی جناب غالب — کہ ہیں حبِّ اسد اللہ کے بے شک مظہر

[1] یہاں تری نہیں بلکہ تیری ہی شمار میں آئیگا، ورنہ ۱۰ عدد کم ہو جائیں گے۔

پھر بہت سے شعراء کا ایک ساتھ ذکر کر کے کہا ہے ؎

یہ سخن رس ہیں سخن سنج ہیں بے مثل و عدیل — ہیں یہ مشہور سب اقلیمِ سخن کے سرور

اور قطعہ میں خود تحسین مجسم انکسار بنے دست بستہ کھڑے ہیں ؎

ان میں تحسین بھی داخل ہے مگر جیسے فقیر — آگے شاہوں کے کھڑا ہووے بحالِ ابتر

۲۔ حدیثِ قدسی

مطبع مصطفائی واقع کانپور سے بدیع الزماں کے اہتمام سے ۱۲۸۱ھ میں طبع ہوئی، سرورق پر یہ قطعہ درج ہے ؎

طالبِ مدحِ نبی را ہر طرف — نعرۂ ہذا حدیثِ قدسی است

شکر خالق را کہ از طبع بدیع — شہرۂ ہذا حدیث قدسی است

خاتمۃ الطبع میں یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چوں دریں آواں بعون کردگار — نعتِ شاہ انبیا مطبوع شد

گفت شائق[1] سال آں از روئے طبع — وصفِ محبوب خدا مطبوع شد

مادہ درج نہیں ہے، مگر شمار کرنے پر چوتھے مصرع (۱۲۷۰ھ) میں 'ط' کے نو عدد ملانے سے ۱۲۷۹ھ نکلتا ہے، یہ قطعہ آغاز طبع میں کہا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس کتاب

[1] شائق۔ حافظ الٰہی بخش خلف شیخ محمد حاجی باشندہ کانپور سید وارث علی سیفی کے شاگرد تھے، انکا دیوان ۱۲۹۵ھ میں چھپا تھا، تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی، ایک کتاب بھی فن تاریخ گوئی میں "آئینۂ تواریخ" کے نام سے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں چھپی تھی جس میں صرف ۱۴۰۰ تک کے مادے شامل تھے، دوسرے ایڈیشن (۱۸۹۸ء) میں مادوں کی تعداد ۲۰۰۰ تک کے اعداد تک کر دی گئی تھی۔ (یہ دونوں ایڈیشن مع دیوان شائق میرے کتاب خانے میں موجود ہیں) کتاب میں ۶۹۶ کے تحت بطور مادہ 'حدیث قدسی' بھی شامل ہے۔

کی ترتیب کا دعویٰ قاضی محمد عمر صاحب نے ان الفاظ میں (حدیث قدسی ص۲) کیا ہے :۔

"...... ۱۲۷۲ھ بارہ سو بہتر ہجری میں فقیر احقر قاضی محمد عمر کے خاطر میں اس اندیشہ نے خطور کیا اور فکر رسا نے اس کوچہ میں رہنمائی کی کہ اگر مخمساتِ غزل قدسی جس قدر دستیاب ہوسکیں جمع کرکے اس صورت سے یہ مجموعہ مرتب کیا جائے ...... کہ شاعر کے نام کے نیچے مختصر حال بھی اس کا مرقوم ہو تو البتہ لطف سے خالی نہ ہوگا اور اسی اندیشہ کی ممد و معاون ہوئی رائے .... حافظ انعام اللہ سلمہٗ ساکن پانی پت کی جس طرح جی چاہتا تھا، صورت مراد نے نقش باندھا ..... اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب سے فراغت ہوئی اور نام اس کا 'حدیث قدسی' رکھا۔"

یاد رہے کہ خمسہ ہائے غزل قدسی، مرتبہ محمد حسین خاں تحسین ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی، اور حدیث قدسی کی ترتیب کا خیال قاضی محمد عمر صاحب کو ۱۲۷۲ھ میں آیا، جو ۱۲۷۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، دراصل قاضی صاحب کو اتنی مدت انتظار کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ انھوں نے اس کی ترتیب میں ذرہ بھر مشقت نہیں اٹھائی، خمسہ ہائے غزل قدسی مرتبہ محمد حسین تحسین چھپی چھپائی سامنے تھی، انھوں نے اس کی اشاعت کے پورے دس سال بعد بہت معمولی حذف اور اضافے کے ساتھ اسی کو اپنی تالیف کہہ کر حدیث قدسی کے نام سے چھاپ دیا[۲]، حذف یہ کیا کہ تحسین کی کتاب کے سرورق کی جگہ 'حدیث قدسی' کا ٹائیٹل اور "غزل ذکر شعراء" کی جگہ اپنے رنگ میں "غزل ذکر شعراء" لکھ ڈالدیے اور اضافہ یہ کیا کہ تحسین کے ایک سو سات[۱۰۷] شعراء کے علاوہ تیرہ دیگر شعراء کے خمسے بڑھا کر تعداد مخمسات ایک سو بیس[۱۲۰] کردی، اور تاریخ خاتمۂ کتاب درج کردی، بعد ازاں بارہ[۱۲] مزید خمسے بھی بدیع الزماں مہتمم مطبع مصطفائی کانپور کے ذریعے موزوں کرا کے کتاب کے آخر میں بعنوان ملحقات شامل کردیے، تحسین نے خمسہ ہائے غزل قدسی کے اختتام پر ناظرین سے امید کی تھی کہ ان کی محنت پر نظر کرکے وہ انھیں دعائے خیر سے یاد فرمائینگے مگر انجام برعکس ہوا، قاضی محمد عمر صاحب تحسین کو دعائے خیر سے یاد تو کیا فرماتے، انھوں نے تو ان کی خمسہ ہائے غزل قدسی (چمن مدح نبی) کو مستقبل کے ذہنوں ہی سے فراموش کردیا،

قاضی صاحب نے پیش لفظ میں کہا تھا کہ وہ ہر شاعر کے نام کے نیچے اس کا مختصر حال بھی مرقوم کریں گے اور دعویٰ بھی کیا تھا کہ جیسا وہ چاہتے تھے، ویسا ہی ہوا بھی، مگر قاضی صاحب کو کہیں اپنے کہے کا پاس نہیں، چنانچہ مختصر حال تو کیا شعراء کے نام وغیرہ بھی وہی ہیں جو تحسین نے خمسہ ہائے غزل قدسی میں دیے ہیں، قاضی صاحب نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں بڑھایا،

۳۔ حدیثِ قدسی

یہ ایڈیشن قاضی صاحب والے ایڈیشن ہی کا نقش اول معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں ملحقات شامل نہیں ہیں، باقی ہر چیز وہی ہے، چونکہ اس کے پہلے چھ[۶] صفحے غائب ہیں اس لیے اسے حدیث قدسی نمبر ۲ کے بعد درج کیا گیا ہے، ورنہ خاتمۃ الطبع میں قطعۂ تاریخ وہی ہے جو ایڈیشن نمبر ۲ میں ہے، مطبع کا علم نہ ہوسکا، کتابت قطعاً جداگانہ ہے،

[۱] ان صاحب کے متعلق اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ [۲] حقیقت یہ ہے کہ قاضی محمد عمر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پورا فائدہ اٹھایا، نظام درہم برہم ہوچکا تھا، کسی کو کچھ ہوش نہ تھا، انیسویں صدی دو حصوں میں تقسیم ہوچکی تھی، اور ۱۸۰۱ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ قصۂ پارینہ بن چکی تھی، ایسے میں تحسین کی "مدح چمن نبی" کسے یاد رہتی، اب بھی اس کا ایک ہی نسخہ تاحال معلوم ہے، جو خوش قسمتی سے میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۴۔ حدیث قدسی۔

یہ ایڈیشن مطبع فتح الکریم بمبئی سے شائع ہوا، غالباً ۱۲۹۹ھ میں چھپنا شروع ہوا اور ۱۳۰۰ھ میں

"...... بعد تصحیح تام وخوش خطی بالا کلام باہتمام جناب قاضی محمد فتح محمد وصالح محمد وعبدالکریم صاحب برادران قاضی ابراہیم صاحب مرحوم فرزندان افضل الحاج قاضی نور محمد صاحب مغفور........"

شائع ہوا۔ یہ قاضی محمد عمر ہی کے ملحقات والے ایڈیشن کا ری پرنٹ ہے، صرف شائق کے قطعۂ تاریخ میں 'ط' کی جگہ 'ل' کے اعداد ڈال دیے گئے ہیں اور شائق کی جگہ ہاتف لکھ دیا گیا ہے، تیسرا اور چوتھا مصرع ملاحظہ ہو ؎

گفت ہاتف سال آں از رُوئے لطف — وصفِ محبوب خدا مطبوع شد

۷۰ ۱۲ + ۳۰ = ۱۳۰۰ھ

۵۔ صحیفۂ قدسی حصہ دوم حدیث قدسی۔

سرورق سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کو حاجی سید شمشیر علی ولد میر عزیز اللہ صاحب ساکن گوہانہ ضلع روہتک نے (جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے) ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں جمع کیا اور محمود المطابع دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا، پیش لفظ ص ۲ پر اپنا شوق مدح خوانی حضرت سرور کائنات وغیرہ بیان کر کے فرماتے ہیں کہ پھر

"...... بری نظر سے حدیث قدسی گزری جو کہ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کر کے چھپوائی تھی، اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا

لے حدیث قدسی کا قاضی محمد عمر کے اہتمام سے ۱۲۷۳ھ میں چھپنا قرین قیاس نہیں، کیونکہ یہ رسالہ خمسہ ہائے غزل قدسی (ضمیمہ مدح نبی) از محمد حسین خاں تحسین ہی کی نقل ہے جو ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوا تھا، قاضی صاحب یہ جرأت نہیں کر سکتے تھے کہ دو ہی سال کے اندر اندر اس سرقے کو اپنے نام سے طبع کرا کے خاص و عام کے لیے شائع کریں اور تحسین کا نام تک نہ دیں۔ غالباً ۱۳۰۳ھ قاضی محمد عمر صاحب کا بیان کردہ ۱۲۷۳ھ ہے۔

کہ میں بھی قدسی کے غزل کے خمسے جمع کر کے چھپوا دوں۔ پس میں نے بھی بعنایت الٰہی کمر ہمت کو باندھ کر جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخباروں میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شاعروں کو بیرون جات میں خط لکھے۔ اب فضل ایزدی سے عرصہ دو سال میں یہ مجموعہ تیار ہو گیا...... بندہ نے التزام کیا ہے کہ جس قدر خمسے پہلے مجموعہ حدیث قدسی میں چھپ چکے ہیں، وہ اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ فقط۔"

حاجی شمشیر علی بھی محمد حسین خاں تحسین کا نام جو غزل قدسی کے مخمسات کے اصل مؤلف ہیں نہیں لیتے اور قاضی محمد عمر کی طرح غلط دعویٰ کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ میرے نسخے کے چند آخری اوراق ضائع ہو چکے ہیں، اس لیے خاتمۃ الطبع اور قطعۂ تاریخ کا علم نہیں، تاہم ان کا یہ دعویٰ کہ پہلے مجموعۂ حدیث قدسی کے خمسے ان کے رسالے میں شامل نہیں کیے گئے، درست نہیں۔ حافظ عبدالرحمٰن خان احسان، مرزا اصغر علی بیگ بلند، زین العابدین خاں حزیں، مرزا قادر بخش صابر، قادر علی عبد، میاں نامی وغیرہ کے خمسے حاجی شمشیر علی نے قاضی محمد عمر ہی کے مجموعے سے لیے اور قاضی محمد عمر کی دکان تو محمد حسین خاں تحسین ہی کے مال سے سجائی گئی تھی،

حاجی صاحب رقم طراز ہیں کہ انھوں نے جنوری ۱۸۸۵ء میں دہلی کے اخبارات میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شعراء بیرون جات کو خط لکھے اور نتیجے کے طور پر خدا کے فضل وکرم سے دو سال میں یہ مجموعہ (حدیث قدسی حصہ دوم) تیار ہو گیا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دسمبر ۱۸۸۶ء یا جنوری ۱۸۸۷ء تک حاجی صاحب کے پاس انکی کوششوں سے خمسوں کی خاصی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی،

اگر یہ سچ ہوتا تو واقعی ایک قابل قدر کارنامہ ہوتا، مگر یہ سچ نہیں ہے،

حاجی صاحب اخلاقی جرأت میں قاضی محمد عمر سے بھی بڑھ کر نکلے، انھوں نے کچھ خمسے قاضی محمد عمر کے یہاں سے نقل کر دیے، کچھ بذریعہ خط و کتابت یا ذاتی تعلقات کی بنا پر حاصل کیے اور ایک بڑی تعداد ہفتہ وار "جریدۂ روزگار" مدراس سے لیکر بغیر کسی حوالے کے درج کتاب کر دیئے، اس بڑی چوری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۸ر اگست ۱۸۸۵ء سے ۲۱ر جولائی ۱۸۸۶ء یعنی صرف سال بھر کے پرچوں سے کم از کم بیس۲۰ خمسے لیکر زیب حدیث قدسی حصۂ دوم کیے گئے ہیں، ۱۸۸۵ء سے پہلے کے پرچوں سے کتنے خمسے لیے گئے یہ معلوم نہیں،

۶۔ جریدۂ روزگار

بارہ بڑے صفحوں کا یہ اخبار مدراس سے ۱۸۷۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا، مالک سید میر تقی شاہ قادری آفندی تھے، ۴-۱۹۰۳ء تک جاری رہا، اور اس وقت اس کے مالک سید مرتضیٰ تھے، غزل قدسی پر جتنی تضمینیں اس اخبار میں شائع ہوئی ہیں شاید اور کہیں نہیں ہوئیں، چار سال ۱۸۸۵ء، ۱۸۸۶ء، ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء کے پرچوں میں دو سو سے زائد خمسے چھپے، یہ تو میرے سامنے ہیں، خیال غالب ہے کہ خمسوں کی مجموعی تعداد پانچ سو کے قریب ہوگی، کوئی صاحب چاہیں تو "حدیث قدسی" حصہ سوم بلکہ حصہ چہارم بھی اس جریدے کی مدد سے بآسانی تیار کر سکتے ہیں،

مندرجۂ بالا سطور سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ قاضی محمد عمر اور حاجی شمشیر علی دونوں قطعی نامعتبر شخصیتیں ہیں،

ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب اس نعتیہ غزل کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کا کلام نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ان کے ہم نام مولانا محمد جان قدسی دہلوی کا

نتیجۂ فکر ہے جو انیسویں یا اٹھارہویں صدی یعنی عہد متاخرین کا شاعر رہا ہوگا، اسکے وجوہ کم و بیش یہ ہیں:

(۱) حاجی شمشیر علی صاحب کی کتاب صحیفۂ قدسی کے اصل متن میں خمسوں کے آغاز سے پہلے بطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے۔

"خمسہ بر غزل حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی"

جس سے ظاہر ہے کہ شاعر کا وطن دہلی تھا،

(۲) مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ کے لفظوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شاعر (قدسی) کے انتقال کو بہت زیادہ مدت نہیں گذری۔

(۳) جامع صحیفۂ قدسی (حاجی شمشیر علی) کو نعت نگار (قدسی دہلوی) کی ذات سے تعلق خاطر تھا، لہذا خمسوں کی ترتیب و تدوین کے وقت اس کو دہلوی لکھنا ایک ایسی شہادت ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، حاجی صاحب نے یہ نسبت بلا تحقیق از خود نہیں لکھی ہوگی اور اس بات کا قطعی امکان نہیں کہ ان کو سہو ہوا ہو، مرتب کی حیثیت ایک واقف کار مورخ کی سی ہے، اور اس کا بیان محقق اور مستند ہے،

(۴) عام طور سے حاجی محمد جان قدسی مشہدی کے دیوان یا کلیات کے متداول نسخوں میں یہ نعت موجود نہیں۔

یہاں ان تمام وجوہ کا نمبروار جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۱) ۱۔ قدسی کے بعد دہلوی لکھنا قطعی سہو کاتب ہے، اور یہ مخمسات غزل قدسی کے پانچ مختلف مجموعوں کا اجمالی ذکر آچکا ہے، یہ سب میرے کتب خانے میں موجود ہیں اور میرے سامنے ہیں، ان سب کو ایک ساتھ دیکھکر کوئی بھی اس نتیجے پر پہنچ

سکتا ہے کہ ان میں کتابت، طباعت اور معیار کلام کے لحاظ سے حاجی شمشیر علی کا مرتبہ "مجموعۂ صحیفۂ قدسی" سب سے ادنیٰ درجے کا ہے۔

پروف ریڈنگ میں بھی قطعاً لاپروائی برتی گئی ہے، اور حاجی صاحب کا اپنا کلام بھی سطحی اور معمولی ہے، حاجی صاحب خود سرورق پر صحیفۂ قدسی کو "مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان بر غزل مولانا محمد جان صاحب قدسیؒ" لکھتے ہیں۔ اگر ان کے ذہن میں کوئی قدسی دہلوی ہوتے تو وہ ان تضمینوں کو "مجموعہ تضمین شعرائے ہندوستان" کیوں کہتے، کیا دہلوی شاعر شعرائے ہندوستان سے الگ ہیں، بالفرض حاجی صاحب نے قدسی کو جان بوجھ کر دہلوی لکھا بھی ہے، تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہ خیال کارفرما ہو سکتا ہے کہ قدسی شاہجہاں کے دربار سے منسلک تھا، اور اسی دربار سے ملک الشعراء کا خطاب اول اس نے پایا تھا،

ب۔ تحسین کی "خمسہائے غزل قدسی" کے ص ۹۹ پر عنایت اللہ خاں قیس کا قطعۂ تاریخ آغاز اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

کیا ہی قدسی کی غزل نعت میں ہو صلِّ علیٰ | جس کے ہر مصرع میں ہر حرف ہی موتی سا جڑا

اس کا تیسرا شعر یہ ہے ؎

شاعروں نے جو لکھے ہند کے خمسے اسکے | جنکے ہر بند پہ قربان ہو دل و جاں اس کا

اس شعر کے مصرعِ اول سے صاف ظاہر ہے کہ ہند کے شاعروں نے خمسے اس شاعر کے کلام پر کہے ہیں جو خود ہندوستان کا رہنے والا نہیں ہے،

ج۔ تحسین ہی کے مجموعے کے ص ۳ پر حاجی محمد اسحاق اسحاق کا خمسہ ہے، اس کا پہلا بند دیکھئے ؎

ہے یہ اسحاق ترا ایک غلام عجمی | اس پہ ہو یک نگہِ لطف رسولِ عربیؐ

تیرے مداح ہیں سعدیؔ و ظہیرؔ قدسیؔ
"................"

اس غلام عجمی کا ذہن قدسیؔ کے بارے میں قطعاً صاف ہے، وہ اسے سعدیؔ اور ظہیر (فاریابی) کے ساتھ رکھتا ہے، خسروؔ اور فیضیؔ کے ساتھ نہیں۔

د۔ تحسینؔ کے خمسہائے غزل قدسی کے سرورق پر قطعۂ تاریخ طبع سے پہلے یہ الفاظ ہیں:

"تاریخ طبع خمسہائے غزلِ قدسی فخرِ شعرا"

طباعت کا آغاز ۱۲۶۹ھ میں ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں فارسی زبان کا شباب ابھی باقی تھا، غالبؔ، مومنؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ سب حیات تھے، کیا اس وقت یا اس سے سو پچاس سال پہلے کا کوئی ایسا عظیم دہلوی شاعر جس کا نام محمد جان تخلص قدسیؔ تھا اور جو اس لائق تھا کہ اسے 'فخرِ شعرا' کہا جا سکے، اس وقت کے فارسی گویوں اور تذکرہ نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا؟

(۲) مرحوم اور رحمۃ اللہ علیہ سے وقت کی تعیین کیونکر ہو سکتی ہے، صرف یہ متعین ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جس کے لیے یہ دعا کی گئی ہے زندہ نہیں، غرض کہ یہ الفاظ کسی مرے ہوئے کے لیے آتے ہیں، اس کے لیے وقت کی قید نہیں، کوئی شخص کسی زمانے میں بھی فوت ہوا ہو اس کے لیے یہ الفاظ بولے اور لکھے جا سکتے ہیں، اور بولے جاتے ہیں، ان الفاظ سے یہ اندازہ کرنا کہ قدسیؔ تخلص کا کوئی شاعر حال ہی میں فوت ہوا ہے، قطعاً نادرست ہے،

(۳) جامع صحیفۂ قدسی حاجی شمشیر علی کو قدسی سے قطعی تعلق خاطر نہ تھا، حاجی صاحب محقق تھے نہ مورخ، عالم تھے نہ مستند، وہ محض مدح خوانیِ رسول اکرمؐ کے غایت درجہ پر شائق تھے، اس وجہ سے اکثر خمسے اور قصیدے وغیرہ انھوں نے یاد کر لیے تھے، وہ

جہاں بھی جاتے اور یہ یاد کیا ہوا کلام سناتے تو لوگ ان سے اس کلام کے طالب ہوتے، چنانچہ انھوں نے لکھنے یا نقل کرنے کی زحمت سے بچنے کے لیے ۱۲۹۳ھ میں مجموعۂ نعت (غزل قدسی کے خمسے نہیں) کے دو حصے چھپوا دیے۔ اس وقت تک قدسی سے تو کیا "حدیث قدسی" مرتبہ قاضی محمد عمر تک سے ان کو واقفیت نہ تھی، حالانکہ حدیث قدسی کو (جو تحسین کی خمسہائے غزل قدسی کی نقل ہے) چھپے چودہ[۱۴] برس گذر چکے تھے، وہ اس بات کا خود اقرار کرتے ہیں، اس لیے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ممکن ہے کہ یہ نعت[۱] قدسی کے کلیات اور دیوان کے متداول نسخوں میں نہ ہو، مگر محض اس بنا پر اسے کسی مفروضہ قدسی دہلوی کی ملک قرار دیدینا صریحاً زیادتی ہے، متداول نسخوں (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) میں شاعر کے سارے کلام کا شامل ہونا ضروری نہیں، ص ۵۴ پر قاضی محمد عمر کی غزل در ذکر شعرا" میں ایک مصرع یوں درج ہے ؎

منظہر دخلص وطراز و صفیر و کافی

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اس صفحے پر طراز کے لیے حاشیے میں فرماتے ہیں کہ "وزن شعر میں لانے کے لیے اس کو طرّار یعنی تشدید کے ساتھ پڑھنا پڑے گا" خمسہ محمد شاہ میر صاحب دہلوی طرّاز تخلص کا ہے نہ کہ طرّار تخلص کا۔ تحسین کے خمسہائے غزل قدسی ص ۴۴ پر تو عنوان میں بھی صاف طرّار لکھا ہے، مگر حدیث قدسی کے متن (ص ۵۵) میں بھی بطور تخلص طرّار ہی مرقوم ہے، ڈاکٹر صاحب نے غور نہیں فرمایا۔

اگر محمد جان قدسی کو حاجی شمشیر علی نے حاجی کے بجائے مولانا لکھا ہے تو انکی عدم واقفیت ہے چونکہ وہ قدسی سے واقف نہ تھے اسلیے انھیں یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ قدسی حاجی بھی تھے، چنانچہ انھوں نے قدسی کو احتراماً مولانا لکھ دیا۔

---

[۱] یہ نعت غزل قدسی کے نام سے مشہور ہے، اسلیے غزلیات قدسی بھی اگر نہ دیکھی ہوں تو دیکھ لینی چاہئیں۔

ادبیات

نعت شریف

از

جناب وفا براہی صاحب

دل رہے مست جامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
لب پہ ہو وردِ نامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

دینِ دو عالم دین ہے انکا، حکم خدا آئین ہے انکا
کلمۂ حق پیغامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

شان فروغ نورِ تجلّی، جلوۂ بامِ طورِ تجلّی
رونقِ صبح و شامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

مدرسۂ تسلیم و رضا ہے، قبلۂ اہلِ صدق و صفا ہے
سایۂ قصر بامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

انفس اہلِ حل و حرم کیا، طائرِ جاں تک روحِ قدس کا
سب ہیں اسیرِ دامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

مہبطِ وحیِ خاصِ الٰہی، منبعِ فیضِ لاتناہی
ہیں لب شیریں کامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

نوح و خلیل و موسیٰ عیسیٰ رکھتے تھے جس اسلام کا دعویٰ
ہے یہ وہی اسلامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

لاکھ غریق بحرِ گنہ ہو، جانتے ہیں سب لوگ وفا کو
رندِ قدح آشامِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

باب التقریظ والانتقاد

Corpus of Arbic & Persian Inscription of Bihar

(A.H. 640. 1200)

از

ڈاکٹر قیام الدین احمد پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی

شائع کردہ:- کاشی پرشاد جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ

از عبد السلام قدوائی ندوی

۱۹۵۰ء میں کاشی پرشاد جیسوال انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں قائم کیا گیا تھا، اسکے قیام کی غرض یہ تھی کہ اونچی سطح پر تحقیقی کام کیا جائے، اس کے ماتحت پانچ ادارے قائم کیے گئے، پالی زبان اور بودھ لٹریچر اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے نالندہ اور سنسکرت زبان وعلوم کے لیے دربھنگہ، ہندی پر کام کے لیے پٹنہ، جین مذہب اور اسکی تعلیمات نیز پراکرت کے لیے وشالی اور فارسی و عربی زبان و علوم پر تلاش و تحقیق کے لیے پٹنہ میں یہ ادارے قائم کیے گئے، موخر الذکر ادارہ کی طرف سے بہار کے عربی و فارسی کے تمام منتشر کتبات کو مرتب کرنے کے لیے ۱۹۶۱ء میں ایک اسکیم تیار کی گئی، ڈاکٹر قیام الدین اس زمانہ میں اس انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، یہ خدمت ان کے سپرد کی گئی، یہ کام بڑا صبر آزما اور محنت طلب تھا، کتبات سارے صوبہ میں پھیلے

ہوئے تھے، مسجدیں، مقبرے، پرانے مدرسے، امراء کے محل اور جاگیرداروں کی حویلیاں سب ہی عمارتوں میں جابجا عبارتیں کندہ ہیں، جن میں ان عمارتوں کے بانیوں کے نام کے علاوہ اور دوسری باتوں کا بھی ذکر ہے، بعض اوقات ان عبارتوں سے ایسی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں جن سے تاریخ کی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں، اور بہت سی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کا سراغ مل جاتا ہے۔ ان سے حکومتوں کے حدود، حکام کے طرزِ عمل اور سلاطین کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے، بہار، یوپی اور بنگال کے درمیان واقع ہے، اس لیے یہاں کے کتبات سے ان قریبی ریاستوں کے روابط اور حالات پر بھی کچھ روشنی پڑ جاتی ہے، مرکز اور صوبوں کے تعلقات کا اندازہ بھی ان عبارتوں سے بہت کچھ ہو جاتا ہے، اسی بنا پر ان کتبات کا پتہ چلانے، ان کو پڑھنے، سمجھنے اور نقل کرنے کی جانب شروع سے اہل قلم اور ارباب سیاست کی توجہ رہی ہے، چنانچہ مسٹر بلوخ من جناب سید حسن عسکری اور ڈاکٹر زیڈ اے ڈیسائی وغیرہ اس سلسلہ میں خاصہ کام کر چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود ایک جامع، مرتب اور مفصل جائزہ کی ضرورت عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی، اسی بنا پر ڈاکٹر قیام الدین احمد کے سپرد یہ کام کیا گیا، انھوں نے بڑی محنت سے سارے صوبہ کا دورہ کیا، شہروں کے علاوہ قصبوں اور دیہاتوں میں بھی انھیں جابجا جانا پڑا، وہ ایسے مقامات پر بھی گئے جہاں پہنچنا بہت دشوار تھا، بعض عمارتیں ایسی غیر معروف ہو گئی ہیں کہ ان کا پتہ چلانے میں بڑی زحمتیں پیش آئیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے ان مشکلات کی پروا نہ کی اور برابر اپنے کام میں لگے رہے، انھوں نے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے یہ کام شروع کیا تھا، ابھی کام نامکمل تھا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا، اس نئی ذمہ داری کے بعد کچھ عرصہ کے لیے یہ کام رک گیا، مگر انسٹی ٹیوٹ کے جوائنٹ ڈائرکٹر جناب سید حسن عسکری صاحب

کی خواہش تھی کہ یہ کام مکمل ہو جائے، وہ ڈاکٹر قیام الدین سے اس کے جاری رکھنے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب کو خود بھی اس کی فکر تھی اس لیے جب بھی انھیں اپنے فرائض منصبی سے کچھ وقت مل جاتا تو اسے کتبات کی تلاش و تحقیق اور جمع و ترتیب میں صرف کرتے، بالآخر کئی برس کی محنت کے بعد یہ کام مکمل ہوگیا، اور کاشی پرشاد جیسوال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک ضخیم جلد شائع ہو گئی، اس کتاب میں کل ۱۹۶ کتبات ہیں جن میں ۷۱ مغل دور سے پہلے کے ہیں۔ ۱۲ پٹھانوں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں، اور ۱۲۹ مغلوں کے زمانہ کے ہیں، ان کتبات کی اصل عبارتوں کے ساتھ ان کے انگریزی ترجمے بھی درج کر دیے ہیں، اور حسب ضرورت ان کی توضیح بھی کر دی ہے، جہاں کہیں کوئی بات قابل تصحیح نظر آئی تو اس کی بھی تصحیح کر دی گئی، آخر میں ایک مفصل انڈکس اور کتبات کے عکس بھی شامل کر دیے گئے ہیں، اس طرح تاریخی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے بہت اچھا مواد فراہم ہو گیا ہے، امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس محنت اور جانفشانی کی قدر کی جائے گی، ابھی بہت سے کتبے صوبہ کے مختلف مقامات میں باقی رہ گئے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو خود بھی اس کا احساس ہے، امید ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے کسی اور اسکالر کو مامور کیا جائے گا کہ وہ ان باقی ماندہ کتبات کا پتہ چلائے، اور اسی خوش اسلوبی کے ساتھ انھیں مرتب کرے تاکہ تاریخ کے کچھ اور گوشے واضح ہو جائیں۔

بہار میں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے، جو اپنے کو ملک کہتی ہے، وہ اپنا نسبی تعلق ملک بیو سے دکھاتے ہیں۔ مگر اب تک ان کی کوئی مستند تاریخ غالباً نہیں لکھی گئی ہے، زیر نظر کتاب میں ملک بیو سے متعلق تین کتبوں کا ذکر ہے، جو ان کے مقبرہ پر کندہ تھے، ان کا مقبرہ بہار شریف کی پیر پہاڑی پر ہے، اس کا حسب ذیل کتبہ تو اب کلکتہ میوزیم میں محفوظ ہے۔

بہ عہد دولت شاہ جہاں گیر
کہ باد اور بہار ملک نوروز

شہنشاہ جہاں فیروز سلطان
کہ بر شاہان گیتی گشت فیروز

ملک سیرت ملک بیو براہیم
کہ بد در دین چو ابراہیم کین توز

بماہ ذی الحجہ یکشنبہ از دہر
بہ ساعت چوں سیزدہ از مہ درین سوز

بہ ہجرت ہفتصد و پنجہ سہ تاریخ
مسافر شد ملک در جنت این روز

خداوندا بہ فضل خویش بر وی
کنی آسان حساب آخرین روز

اس کے مشرقی دروازہ پر اب تک یہ کتبہ کندہ ہے،

این مقطع بہار ملک سیف دولتت
کز سہم تیغ او سپر انگندی آفتاب

بت را ہمیں شکست چو ہمنام خویش تا
در عالم بقاش شود بت شکن خطاب

صفدر او صف شکن چو صف آراستی بہ حرب
رستم بہ تب فتادی و بہمن شدی ز آب

خورشید گرچہ لشکر سیارہ را شکست
آخر ز کوہ ساخت سرا پردہ حجاب

تاریخ آفتاب کہ یکشنبہ از جہاں
چوں لعل رفت در دل سنگ از برائے خواب

بود از مہ معظم فی الحجہ سیزدہ
واز سال بد ہفتصد و پنجہ سہ در حساب

تیسرا کتبہ ہے:۔

درین گنبد کہ ہست از روئے معنی
بہ قدر از گنبد افلاک برتر

بہ خفتست شیر مردی کز نہیبش
نہ خفتے شیر اندر بطن......[1]

مدار ملک ابراہیم بو بکجہ
کہ تیغ از بہر حق می زد چوں حیدر

چنیں لشکر کشی کشور کشائی
نہ خیزد دوم اندر ہفت کشور

کنوں چوں بر درت افتاد یارب
ز راہ لطف بکشائی بر و در

---

[1] پڑھا نہیں جا سکا۔

بہ مشک رحمت و کافور رافت
کنی دیوار خاکش را معطر

ان کتبات سے لائق مرتب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ملک بیو ابوبکر کے لڑکے تھے، بت شکن مجاہد اور صوفی تھے، ان کا خطاب سیف الدولہ تھا، بہار کے مقطع مقرر ہوئے، ان کا سنہ وفات ۷۵۳ھ ۲۰ رجنوری ۱۳۵۳ء ہے جو فیروز شاہ تغلق کا عہد ہے، ملک بیو فیروز شاہ تغلق سے پہلے محمد بن تغلق کے عہد میں بھی بہار کے مقطع مقرر ہوئے ہوں گے مگر ان کا ذکر کسی معاصر تاریخ میں نہیں[۱]، فاضل مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک بیو سید تھے، مگر مذکورہ بالا کتبات میں ان کے سید ہونے کا ذکر نہیں، کتبات سے یہ بھی ظاہر نہیں کہ ان کا مقبرہ کس نے بنایا، گنج رشیدی کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ انکے بڑے لڑکے سید داؤد نے اس کی تعمیر کی، اگر ان کے لڑکے اپنے نام کے ساتھ سید لکھتے تھے تو اس سے ان کا سید ہونا ثابت ہو سکتا ہے، ملک ابراہیم بیو کس کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے، کتبہ سے اسکی وضاحت بھی نہیں ہو سکی ہے[۲]، "بیو" کیوں کہلائے، اس کی بھی خاطر خواہ تحقیق نہیں ہو سکی، حاشیہ پر یہ درج ہے کہ وہ سلطان محمد بن تغلق کی خدمت میں ایک بڑی فتح کے بعد پہنچے تو سلطان نے یہ کہکر ان کا استقبال کیا، ملک بیا، ملک بیا، یہی بعد میں مقامی زبان میں بیو ہو گیا۔

ان باتوں سے قطع نظر زیر نظر کتاب ایک بہت ہی عمدہ تاریخی تحفہ ہے، جس کی اشاعت پر کے۔ پی۔ جیسوال انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے، اور اسکے جواں سال، جواں ہمت اور علم و تحقیق کے شائق مرتب پروفیسر قیام الدین کی محنت و کاوش قابل تحسین ہے۔

---

[۱] مختصر تاریخ ملک میں منشی گیا پرشاد کے حوالہ سے اسکا ذکر ہے جو حاشیہ پر درج ہے [۲] ڈاکٹر ڈیسائی نے ایک قدیم مخطوطہ کی بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ بنگال کے بادشاہ شمس الدین کے حملہ کے دوران ملک بیا شہید ہوئے، اسی کے انتقام کے لیے سلطان فیروز شاہ تغلق نے بنگال پر چڑھائی کی۔

مطبوعات جدیدہ

سیرت ابن اسحٰق۔ تحقیق و تعلیق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، طباعت اچھی، صفحات ۳۹۵ علاوہ مقدمہ، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ:
معہد الدراسات والابحاث ص، ب، ۳۰۴ الحساب لبریدی الجاری ۵۴۔۱۵۔ الرباط۔ المغرب

محمد بن اسحٰق ممتاز تابعی اور فن مغازی و سیرت کے امام تھے، ان کی کتاب السیر والمبتدا والمغازی ابتدا میں کثرت سے پھیلی، بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کیے اور یہ سیرت کی اکثر کتابوں کا ماخذ بن گئی، سیرت ابن ہشام دراصل اسی کا منتخب ہے، جس کی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے ابن اسحٰق کی سیرت کیجانب ایسی کم توجہ ہو گئی کہ وہ عرصہ سے بالکل ہی ناپید تھی، سیرت رسول کے عاشق اور فدائی ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے مراکش کے بعض فضلاء کے تعاون سے اس کے چند اجزاء اہتمام سے شائع کیے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو سیرت ابن اسحٰق کے پہلے ٹکڑے (قطعہ) کا ایک جزء اور دوسرے ٹکڑے کے چار اجزاء جامعۃ القرویین (فاس) اور کچھ مزید حصہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ سے حاصل ہوا، انھوں نے ان حصوں کو مقابلہ، تصحیح اور تحشیہ کے بعد اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، فاس کے نسخے کے جو اجزاء شائع کیے گئے ہیں، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب، پیدائش، والد، دادا، تبع اور اصحاب الفیل کے علاوہ نبوت سے قبل اور بعد کی مکی زندگی کے متعدد اور مدنی زندگی کے بھی دو ایک واقعے شامل ہیں، دمشق کے مخطوطہ میں بعض غزوات

(بدر، سویق، ذی امر، قینقاع، احد) اور کعب بن اشرف کے واقعہ کا ذکر ہے، مقدمہ میں پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہمیت و عظمت کا ذکر ہے جس کے مسلمان ہی نہیں انصاف پسند غیر مسلم بھی معترف ہیں، پھر اسلام سے پہلے اور اس کے بعد عہد نبوی اور عہد صحابہ میں عربوں کی تاریخ نویسی کے فن سے دلچسپی کا ذکر ہے، اس ضمن میں احادیث کی تحریر و کتابت اور جمع و تدوین کا ذکر بھی آگیا ہے، اس کے بعد تابعین کے زمانہ کی تاریخ و سیر کی کتابوں کے نام اور ابن اسحٰق کے حالات زندگی ہیں، اور ان کی توثیق و عدم توثیق کے متعلق ائمۂ فن کے اقوال بھی ہیں، اس سلسلہ میں امام مالکؒ اور ہشام بن عروہ کے نقد و جرح کا خاص طور پر ذکر کر کے اس کی حقیقت واضح کی گئی ہے، مقدمہ کے آخر میں سیرت ابن اسحٰق کے راویوں اور اس کے نسخوں اور دستیاب اجزاء کے متعلق معلومات کے علاوہ اس کی بعض شرحوں اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجموں کا ذکر ہے، کتاب کے آخر میں قرآنی آیتوں، اشعار، اسماء و اعلام اور مضامین کے اعتبار سے چار فہرستیں اور ابن اسحاق و ابن ہشام کی کتابوں کے مقابلہ کے لیے ایک جدول دیا گیا ہے، گو اس کتاب کا بڑا حصہ ابن ہشام کی سیرت میں شامل ہونے کی وجہ سے محفوظ ہے، تاہم جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا ہے "ابن ہشام نے بعض مفید اور ضروری باتیں اور بہت سے اشعار حذف کر دیے تھے، اس لیے نیز سیرت اسحٰق کی قدامت کی بنا پر اس کی اشاعت کی ضرورت اور فائدہ مسلم ہے، کتاب مکمل نہیں ہے، تاہم اس کی اشاعت سے ڈاکٹر صاحب کے علمی کارناموں میں ایک اور اہم کارنامے کا اضافہ ہوا، اہل علم کو انکا ممنون ہونا چاہیے، اگر مولانا شبلی مرحوم زندہ ہوتے تو ان کو بڑی خوشی ہوتی، ڈاکٹر صاحب نے سیرت ابن اسحٰق کے شیخ سعدی کے زمانہ کے جس فارسی ترجمہ کا ذکر کیا ہے اس کا قلمی نسخہ مولانا نے الہ آباد میں ملاحظہ فرمایا تھا،

سرسید ہال ریویو اولڈ بوائز نمبر } نگراں ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، ایڈیٹر ملک خالد حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی صفحات ۲۹۶، قیمت تحریر نہیں، پتہ:- سرسید ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مدرسۃ العلوم جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے، ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا تھا، اسی سال چند ماہ بعد ایک بورڈنگ ہاؤس کا قیام بھی عمل میں آیا تھا، جو آگے چل کر سرسید ہال کے نام سے موسوم ہوا، ۱۹۷۵ء میں یونیورسٹی اور ہال کے یوم تاسیس کی صد سالہ تقریب کے موقع پر ہال کے موجودہ طلبہ اور نگراں نے ایک خاص نمبر شائع کیا ہے، یہ تقریباً دو درجن مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں قدیم طلبہ نے اپنے علی گڑھ میں داخلہ سے قیام کے زمانہ تک کی روداد اور اقامتی زندگی کی سرگذشت قلمبند کی ہے، اس سے یونیورسٹی اور ہال کے ہر دور کی خصوصیات، اقامتی زندگی کے آداب، یونیورسٹی کے بعض قدیم اساتذہ، اس کے بانی سرسید احمد خاں مرحوم اور اس سے وابستہ دوسرے اہم اور ذمہ دار لوگوں کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتے ہیں، قدیم لوگوں میں میاں محمد امین، سید طفیل احمد منگلوری، خواجہ عبد العلی، میر ولایت حسین، ڈاکٹر شیخ عبد اللہ، سر رضا علی، عبد المجید قریشی، حکیم احمد شجاع اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے مضامین ماخوذ ہیں، متعدد نئے مضامین اسی نمبر کے لیے لکھے گئے ہیں، یہ سب مضامین موثر اور پڑھنے کے لائق ہیں، پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، قاضی محمد عدیل عباسی، آل احمد سرور، احمد شفیع قریشی سابق وزیر مملکت ریلویز اور خود اس نمبر کے نگراں ڈاکٹر اصغر عباس کے مضامین خاص طور پر قابل توجہ ہیں، یہ نمبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سرسید ہال سے متعلق گذشتہ صد سالہ واقعات اور قدیم طلبہ کے تجربات و تاثرات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے سبھی کے لیے دلچسپ ہے، علی گڑھ سے تعلق رکھنے والے اصحاب تو خاص طور پر اس سے محظوظ ہوں گے، آخر میں مضمون نگاروں کا تعارف

بھی ہے لیکن طباعت مسلم یونیورسٹی کے مطابق نہیں ہے اور کتابت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں،

مسلمان اور وقت کے تقاضے ۔ از مولانا عبد السلام قدوائی ندوی۔

تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۳۶ مجلد، قیمت ۶ روپے

پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مکتبہ جامعہ نے مولانا عبد السلام قدوائی ندوی شریک ناظم دار المصنفین کا یہ دوسرا مجموعہ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، جو حسب ذیل گیارہ مضامین پر مشتمل ہے، (۱) مسلمانوں کے لیے راہ عمل (۲) وقت کا تقاضا (۳) اسلام کا پیام امن و اتحاد (۴) دین و دنیا ہم آمیز کہ اکسیر شود (۵) عبادت کا مفہوم (۶) روح قرآن، (۷) راہ ہدایت (۸) حدیث نبویؐ کے اولین صحیفے (۹) استقامت (۱۰) بے نفسی کی حیرت انگیز مثال (۱۱) ایمان کی تاثیر۔ اکثر مضامین میں موجودہ حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے لیے راہ عمل تجویز کی گئی ہے، انھیں حسن اخلاق اور خدمت خلق کے جوہر سے آراستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسی طرح دنیا میں ان کی افادیت کا وزن محسوس کیا جائے گا، ان کے خلاف پھیلی ہوئی بدگمانیاں دور ہوں گی اور وہ اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکیں گے، اس سلسلہ میں اسلاف کے موثر، سبق آموز اور ولولہ خیز واقعات بیان کیے گئے ہیں، امید ہے کہ ان مضامین کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے بہت مفید ہوگا، اور غیر مسلم بھی اسلام کی صحیح تعلیمات سے واقف ہوں گے،

پریم چند ۔ مرتبہ پروفیسر پرکاش چند رگپت، مترجمہ جناب ل۔ احمد اکبرآبادی،

تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۱۸، قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

پتہ: ساہتیہ اکاڈمی، رابندر بھون، نئی دلی۔

اردو ہندی کے نامور افسانہ و ناول نگار منشی پریم چند پر اردو میں پہلے بعض اچھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس نئی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اختصار کے باوجود پریم چند کی سیرت، شخصیت، حالات، کمالات، گھریلو زندگی، اردو ہندی خدمات، ناول، افسانہ اور ڈرامہ نگاری کے خصوصیات وغیرہ کا تجزیہ اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے، مصنف نے پریم چند کے خطوط کے علاوہ ان کے اعزہ و احباب کی تحریروں سے زیادہ مدد لی ہے، اسلیے یہ مستند بھی ہے، اس سے ان کے عہد، ماحول، ذہنی خیالات، سیاسی و قومی رجحانات، اور حب الوطنی کا خاکہ سامنے آجاتا ہے، مگر کہیں کہیں زبان و بیان کی فروگذاشتیں بھی ہیں، مثلاً سنجیدہ اور گھریلو وصف شامل ہوگئے تھے، (ص۹)، پریم چند کے طویل مدت تک ...... (ص۲۲) گاندھی جی کے ستیہ گرہ کی چھاپ ...... (ص۳۶) مگر اسے ناانصافی کے سامنے جھکنا نہیں جانتا (ص۵۰) یہاں کاشتکاروں کا خون چوسنے والی اور ان پر جبر و ستم ڈھانے والے سب ہی اکٹھا ہوگئے ہیں (ص۵۰) اپنی عادۃً ہنسی میں ہنس کر بولے (ص۵۰) پریس لگانا (ص۵۵) منصوبہ بھی پکا رہے تھے (ص۵۸) اس کی ذات میں مہاتما گاندھی کی کرداری خصوصیات ہندوستان کے روایتی بھکاری کے پیشہ ...... (ص۶۲) تقدیم و تاخیر میں بھی بے احتیاطی ہوگئی ہے، مثلاً ایک دوسری پڑھانے کی نوکری (ص۲۲)، مزمن پیچش کے مرض (ص۲۴) ایک تین کمرے کے مکان ...... (ص۲۸) اردو املا میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اردو ترقی بورڈ نے جو اصلاحی سفارشات پیش کی ہیں ان پر اگرچہ ابھی بحث کی گنجائش ہے، لیکن اس کتاب میں ان کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اسی لیے اقتباسات تک میں تصرف ہے جیسے مہینا، پتا، پیسا، نقشا، بانو، خطبۂ صدارت، حال آنکہ، غت ربود، مگر بعض لفظوں کا املا اس طرح بھی ہے، روپیہ، زمانہ، بھروسہ وغیرہ اور بعض لفظوں کا

املا دونوں طرح ہو مثلاً خاصہ، خاصا، خاکہ، خاکا، گاؤں، گانو وغیرہ، ایک زمانہ میں بلاضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال فیشن بن گیا تھا، آجکل بعض اہل قلم متبادل اردو لفظوں کے ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس کتاب سے اس کی چند مثالیں یہ ہیں: ماتر بھومی کے سچے سپوت، پتی، بر، دیوی، ماتا پتا، سورگ، آدرش وادی، جنتا، اندولن، بھرشٹاچاری، پوتر، شاید انکے استعمال کی وجہ یہ ہو کہ ساہتیہ اکیڈمی اپنا خاص اسلوب پیش کرنا چاہتی ہو، یہ کتاب ہندی سے ترجمہ کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے ترجمہ رواں اور بہتر ہے لیکن بعض الفاظ اور جملے ہو بہو ہندی اسلوب کا چربہ معلوم ہوتے ہیں، جیسے ہندستانی پٹھان، گھر گھنے وغیرہ، جناب ل۔ احمد اکبرآبادی اردو کے مشہور اور ممتاز اہل قلم ہیں، معلوم نہیں انھوں نے اس قسم کی زبان اپنے ترجمے میں کیوں روا رکھی، مختصر ہونے کی وجہ سے یہ کتاب اسکول اور کالجوں کے طلبہ کیلئے مفید ہے، اگر بعض تشریح طلب باتوں اور ناموں پر مختصر حاشیے بھی لکھ دیے جاتے تو اس کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی۔

فہرست مخطوطات (جلد اول) مرتبہ مولانا سید محمد متین ہاشمی، مولانا ساجد الرحمن صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۲۴۲ مجلد، قیمت للعہ، ناشر: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، پاکستان۔

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (لاہور) نے مخطوطات فراہم کرکے انکی تفصیلی فہرست شائع کرنیکا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں مصاحف، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، ادب، اور طب وغیرہ مختلف فنون کی عربی و فارسی کتابوں کی فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے، مرتبین نے مخطوطات کے ساتھ اوراق کی تعداد، نشان خط، کاتبوں اور مصنفوں کے ناموں کی تصریح اور ترقیمہ، آغاز و اختتام کی عبارتوں کو نقل بھی کیا ہے، مخطوطات کی اہم خصوصیات اور مصنفین کے حالات بھی تحریر کیے ہیں، فہرست کے آخر میں کئی اندکس اور بعض مخطوطات کے عکسی فوٹو بھی ہیں، اگر فہرست کی ترتیب سے عنت منزد ظاہر ہوتی ہے لیکن مصنفین کے حالات اصل آخذ کے بجائے ثانوی آخذ سے لیے گئے ہیں، اور مشہور مصنفین کے تذکرے میں خواہ مخواہ طوالت پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کی قیمت زیادہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۰ ماہ جمادی الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۷ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد